جُمادی الاُخریٰ ۱۴۴۴ھ
جنوری ۲۰۲۳ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیم اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

جُدا ہو دِیں سیاست سے .....!
بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

داعی رجوع الی القرآن بانی تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیان القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر

اب دو انداز سے دستیاب ہے

- خوبصورت ٹائٹل - عمدہ سفید کاغذ - معیاری طباعت

1 2935 صفحات پر مشتمل، سات جلدوں میں
(الگ الگ جلدیں بھی دستیاب ہیں!)
مکمل سیٹ کی قیمت: 6000 روپے

2 متعدد اضافی خوبیوں کا حامل، طبع جدید
- قرآنی رسم الخط - تفسیری سائز - مضبوط ریگزین جلد
2560 صفحات پر مشتمل، چار جلدوں میں
مکمل سیٹ کی قیمت: 6000 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 72
شمارہ : 1
جمادی الاُخریٰ 1444ھ
جنوری 2023ء
فی شمارہ : 50 روپے
سالانہ زرِتعاون: 500 روپے

مُدیر
حافظ عاکف سعید

مجلسِ ادارت:
ایوب بیگ مرزا، خورشید انجم

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

ادارتی معاون:
حافظ محمد زاہد، محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700 ، فون: 3-35869501
فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org
ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321
publications@tanzeem.org
ویب سائٹ: www.tanzeem.org
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: ”دارُالاسلام“ ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ 53800) فون: (042)35473375-78
پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال — 5
باطل کے سامنے اُمّتِ مُسلمہ کا سرنڈر؟ — ادارہ

بیانُ القرآن — 9
سورۃ الحاقّۃ — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تذکرہ وتبصرہ — 18
جُدا ہو دیں سیاست سے .....! — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

علومِ قرآنی — 69
اقسامِ وحی اور قرآن حکیم (۲) — پروفیسر حافظ قاسم رضوان

انوارِ ہدایت — 77
شرک کا گناہ — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

باطل کے سامنے اُمّتِ مُسلمہ کا سرنڈر؟

اُمّت قطر میں فیفا ورلڈ کپ کے انعقاد پر دنیا بھر کے مسلمان خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس لیے بھی کہ قطر نے دورانِ ورلڈ کپ شراب' ٹرانسجینڈ رز وغیرہ کے حوالے سے پابندیاں لگا کر اپنی اَقدار اور خود اختیاری کے حوالے سے ایسے فیصلے کیے جو مغربی تسلّط کے اس دور میں قابلِ تحسین ہیں۔ اکثریت اس بات پر بھی خوش ہے کہ نعرہ ہائے تکبیر بلند ہوتے رہے' فلسطینیوں کے حق میں ''سرِ عام'' نعرے لگتے رہے' وغیرہ۔ ہمارا اسیکولر طبقہ جو اُمّتِ مُسلمہ کے زوال اور شکست خوردگی کی اصل وجہ مادّی ترقی اور تعلیم و ٹیکنالوجی میں پیچھے رہ جانا گردانتا رہا ہے' اب ممکن ہے عالمِ عرب کی مادّی ترقی میں صلاحیت واہلیت پر کچھ مارکس دینے پر راضی ہو جائے' تاہم یہ لمحۂ فکریہ ہے کہ ہم اس قدر گر چکے ہیں کہ اب ورلڈ کپ کے انعقاد کو اپنی سب سے بڑی کامیابی گردان رہے ہیں۔ کیا ایسی عارضی اور دنیوی کامیابیاں ہی اُمّتِ مُسلمہ کو کفایت کر جائیں گی؟

اس میں شک نہیں کہ اسباب کے لحاظ سے مادّی ترقی' تعلیم' سائنس اور ٹیکنالوجی بھی ضروری ہیں' مگر کامیابی کا انحصار صرف ان چیزوں پر ہی ہوتا تو افغانستان میں پوری دنیا کے وسائل' سائنس و ٹیکنالوجی جھونکنے کے باوجود عالمی طاقتیں یوں رسوا ہو کر نہ نکلتیں۔ معلوم ہوا صرف مادّی وسائل و اسباب ہی کامیابی اور فتح کے لیے کافی نہیں' ورنہ بدر کے میدان میں صرف ۳۱۳ بے سروسامان کیل کانٹے سے لیس ایک ہزار کے لشکر پر یوں حاوی نہ ہو جاتے۔ پھر جب فاتحینِ بدر کے وارثین کو عالمی حکومت نصیب ہوئی تو ایک وقت آیا کہ فتح و کامرانی کے اصل راز کو بھلا کر اس نے بھی صرف تعلیم' سائنس' آرٹس' مال و دولت اور دنیوی شان و شوکت کو فضیلت کا معیار سمجھا۔ دنیا کے علوم وفنون کا مرکز بغداد تھا۔ فلسفہ' علم الکلام' سائنس' طب' فلکیات میں عالمِ اسلام کے ماہرین کا شہرہ سن کر پوری دنیا سے لوگ حصولِ علم کے لیے جوق در جوق بغداد کا رُخ کر رہے تھے۔ یہ شہر اپنی ترقی و خوشحالی' مال و دولت' تجارت' مارکیٹس' یونیورسٹیز اور لائبریریز کی بدولت موجودہ دور کے نیویارک' واشنگٹن' شنگھائی کی طرح دنیا بھر میں کشش کا حامل تھا۔ خلیفہ کے محلات زر و جواہر' عیش و عشرت' شان و شوکت میں اپنی مثال آپ تھے۔ لیکن یہ سب مال و اسباب اور شان و شوکت ہونے کے باوجود آسمان نے وہ دن بھی دیکھا جب اہلِ بغداد کی کھوپڑیوں کے مینار بنائے گئے اور اتنا خون بہا کہ کہا جاتا ہے دریائے دجلہ کا پانی چند

دن سرخ ہو کر بہتا رہا اور پھر سیاہ پڑ گیا۔ سرخی کی وجہ اہلِ بغداد کا وہ خون تھا جو ہلاکو خان کے ہاتھوں قتلِ عام کی وجہ سے گلیوں میں بہ بہ کر دریا میں شامل ہوتا رہا اور سیاہی کی وجہ دریا برد کی گئی کتب کا وہ انبار تھا جو علوم وفنون کی ترقی کے لیے چھاپا گیا تھا۔ یونان' روم اور دنیا بھر سے کتب منگوا کر ان کے ترجمے شائع کیے جا رہے تھے جن سے بغداد کی لائبریریاں' کتب خانے اور مدرسے بھرے ہوئے تھے۔

ہلاکو خان کا وزیر نصیر الدین طوسی (جو اُس وقت وہاں موجود تھا) بیان کرتا ہے کہ خلیفہ کو چند دن بھوکا رکھنے کے بعد اس کے سامنے ایک ڈھکا ہوا خوان لایا گیا۔ بھوکے خلیفہ نے بے تابی سے ڈھکن اٹھایا تو دیکھا کہ خوان ہیرے جواہرات سے بھرا ہوا ہے۔ ہلاکو نے کہا: کھاؤ! مستعصم باللہ نے کہا: ہیرے کیسے کھاؤں؟ ہلاکو نے جواب دیا: اگر تم ان ہیروں سے اپنے سپاہیوں کے لیے تلواریں اور تیر بنا لیتے تو میں دریا عبور نہ کر پاتا۔ عباسی خلیفہ نے جواب دیا: خدا کی یہی مرضی تھی۔ ہلاکو نے کہا: اچھا' تو اب میں جو تمہارے ساتھ کرنے جا رہا ہوں وہ بھی خدا کی مرضی ہے۔ اس نے خلیفہ کو محلات کے قیمتی قالینوں میں لپیٹ کر ان کے اوپر گھوڑے دوڑا دیے اور خلیفہ ذلت کی موت مر گیا۔

ہلاکو خان باطل لشکر کا سپہ سالار تھا۔ اُس کے نزدیک فتح و کامرانی کا راز صرف تیر و تلوار اور فنونِ سپہ گری میں تھا۔ اس لیے اس نے خلیفہ کو بھی یہی آدھا سبق یاد دلایا' حالانکہ ان سب چیزوں کے باوجود خود ہلاکو خان کا جو انجام ہوا اُس نے ثابت کر دیا کہ پورا سبق کچھ اور ہے۔ بغداد پر ہلاکو خان کا حملہ دراصل اُمّت اور اس کے غافل حکمرانوں کو وہی بھولا ہوا پورا سبق یاد دلانے کے لیے تھا جو شروع میں ہی اس اُمّت کو پڑھا دیا گیا تھا اور قرآن میں محفوظ بھی کر دیا تھا مگر اُمّت اسے بھول گئی تھی:

﴿لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَ اَنۡزَلۡنَا مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ وَ اَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ فِیۡہِ بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِیَعۡلَمَ اللّٰہُ مَنۡ یَّنۡصُرُہٗ وَ رُسُلَہٗ بِالۡغَیۡبِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ﴿۲۵﴾﴾ (الحدید)

''ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان اُتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ اور ہم نے لوہا بھی اُتارا ہے' اس میں شدید جنگی صلاحیت ہے اور لوگوں کے لیے دوسری منفعتیں بھی ہیں' اور تاکہ اللہ جان لے (ظاہر کر دے) کہ کون مدد کرتا ہے اُس کی اور اُس کے رسولوں کی غیب میں ہونے کے باوجود۔ یقیناً اللہ بہت قوت والا' بہت زبردست ہے۔''

اللہ کی مرضی یہ نہیں تھی کہ دوسرے لوگوں کی طرح یہ اُمّت بھی کھیل کود' دنیوی شان و شوکت' زر و جواہرات اور مالِ دنیا کو فضیلت کا معیار سمجھ لے' بلکہ مشیتِ ایزدی یہ تھی کہ اُمّت وہ اہم فریضہ ادا

کرے جس کے لیے اسے اٹھایا گیا تھا:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ﴾ (آلِ عمران:۱۱۰)

’’تم وہ بہترین اُمت ہو جسے لوگوں کے لیے برپا کیا گیا ہے‘ تم حکم کرتے ہو نیکی کا اور تم روکتے ہو بدی (منکر) سے‘ اور تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر۔‘‘

جنگی صلاحیت‘ فنونِ سپہ گری‘ سائنس‘ اقتصادی ترقی وخوشحالی اسباب کے لحاظ سے ضروری ہے تا کہ رسولوں کے مشن کو جاری رکھتے ہوئے دنیا میں باطل کا راستہ روکنے اور انصاف کو قائم کرنے میں آسانی ہو‘ مگر اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ایک لازمی شرط بیان کی اور وہ ہے الکتاب اور میزان۔ اُمت کا اصل مشن قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں نظامِ عدل قائم کرنا تھا تا کہ انصاف قائم ہو۔ اہلِ بغداد نے یونان‘ روم‘ مصر اور دنیا بھر سے فلسفہ اور علم الکلام کی کتابیں منگوا کر ان کے ترجمے کروائے‘ جو اچھی بات تھی‘ لیکن ان کے مقابلے میں ’’الکتاب‘‘ کو پسِ پشت ڈال دیا۔ انہوں نے سائنس‘ طب‘ فلکیات اور دوسرے علوم وفنون کو فروغ دیا لیکن ’’المیزان‘‘ کو قائم کرنا بھول گئے۔ مال ودولت‘ شان وشوکت کو لازم سمجھا‘ لیکن باطل‘ برائی اور طاغوت کے خلاف جہاد کی تیاری کرنا بھول گئے۔ بحیثیت اُمت یہی وہ بڑے جرائم تھے جن کی سزا اللہ نے ہلاکو کو بھیج کر دی اور بغداد چند دنوں میں انسانی خون اور لاشوں سے اس قدر تعفن زدہ ہو گیا کہ خود ہلاکو خان کو شہر سے باہر جا کر خیمہ لگانا پڑا۔ قرآن حکیم کی مندرجہ ذیل آیات کس قدر فکر انگیز ہیں:

﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْۗءَ الْعَذَابِ ۭ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ښ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۱۶۷ وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۡ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۱۶۸﴾ (الاعراف)

’’اور (یاد کرو) جب آپ کے رب نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ لازماً مسلط کرتا رہے گا ان پر قیامت کے دن تک ایسے لوگوں کو جو انہیں بدترین عذاب میں مبتلا کرتے رہیں گے۔ یقیناً آپ کا رب سزا دینے میں بہت جلدی کرتا ہے‘ اور یقیناً وہ غفور بھی ہے اور رحیم بھی۔ اور ہم نے انہیں زمین کے اندر منتشر کر دیا فرقوں کی صورت میں‘ ان میں سے کچھ لوگ صالح ہیں اور کچھ وہ بھی ہیں جو دوسری طرح کے ہیں۔ ہم انہیں بھلائی اور برائی سے آزماتے رہے ہیں کہ شاید یہ لوگ لوٹ آئیں۔‘‘

جب بھی نصیحت پر مشتمل ایسی آیاتِ قرآنی ہمارے ’’خواص‘‘ وعوام کے سامنے بیان کی جاتی ہیں تو ان کا اطلاق فوراً بنی اسرائیل پر کرنا تو ہمیں یاد رہتا ہے لیکن خود اپنے بارے میں بھول جاتے ہیں کہ ہم بھی ایک مسلمان اُمت ہیں اور بحیثیتِ اُمتی ہماری بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ اگر اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہ کرنے کی وجہ سے بنی اسرائیل پر ایسے عذاب آ سکتے ہیں تو ہم کیا اللہ تعالیٰ سے سرٹیفکیٹ لیے بیٹھے ہیں کہ ہمارے کرتوت خواہ جیسے بھی ہوں‘ اُس نے بہرصورت ہماری مدد کا وعدہ کر رکھا ہے؟ اور یہ کہ بس محمد رسول اللہ ﷺ کا اُمتی ہونے کی وجہ سے ہمیں ہر حال میں شفاعت مل جائے گی؟ حالانکہ اللہ کے رسول ﷺ قسم کھا کر تنبیہ فرما رہے ہیں:

’’قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے‘ تم لازماً نیکی کا حکم دو گے اور بدی سے روکو گے‘ ورنہ اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر ایسا عذاب لے آئے گا کہ پھر تم دعائیں مانگو گے لیکن اللہ تعالیٰ تمہاری دعا قبول نہیں کرے گا۔‘‘ (ترمذی)

جب اللہ کے رسول ﷺ قسم کھا کر ایسا فرما رہے ہیں تو پھر اس بات میں کیا شک باقی رہ جاتا ہے کہ یہ اُمت اپنے اصل دینی فریضہ کو ترک کر دینے کی وجہ سے اللہ کے عذاب کا شکار نہیں ہو گی؟ آج برما‘ کشمیر‘ فلسطین‘ سنکیانگ‘ چیچنیا‘ بھارت سمیت دنیا بھر میں مسلمانوں کا گھیرا تنگ ہے۔ ان کا قتل عام کیا جا رہا ہے‘ زمینوں پر قبضے کیے جا رہے ہیں‘ مساجد کو گرایا جا رہا ہے۔ ان کی عورتوں کے حجاب نوچے جا رہے ہیں اور طرح طرح کے مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔ دنیا میں سب سے بڑے مذہبی‘ دینی اجتماعات بھی مسلمانوں کے منعقد ہو رہے ہیں۔ حج‘ عمرہ‘ رمضان میں کروڑوں مسلمان رو رو کر دعائیں مانگ رہے ہیں لیکن اللہ کی مدد ونصرت کیوں نہیں آ رہی؟ یہاں تک کہ آزاد مسلم ریاستیں بھی شکنجۂ باطل میں ہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ پاکستان میں تین مرتبہ سود کے خلاف عدالتی فیصلے آنے کے باوجود حکومتیں اس کو ختم کرنے پر تیار نہیں ہو رہیں۔ عالم عرب جو اسلام کا مرکز تھا آج شیطانی ایجنڈوں کا گڑھ بن گیا ہے۔ سعودی خاندان نے حجاز کی مقدس سرزمین پر شیطانی رسوم کو انٹرٹینمنٹ کے نام پر عوام کے اندر فروغ دینا شروع کر دیا ہے۔ گزشتہ سال کی طرح اس سال بھی ۳۱/اکتوبر کو ’’ہالووین‘‘ کا شیطانی جشن منایا گیا جس میں سعودی جوانوں نے خوفناک میک اپ‘ خون آلود لباس اور ڈراؤنے ماسک پہن کر ریاض کی سڑکوں پر مارچ کیا۔ اس سے پہلے سعودی ولی عہد محمد بن سلمان ملک میں جوئے‘ شراب نوشی‘ رقص‘ مرد عورتوں کی مشترکہ پارٹیوں‘ سینماؤں میں مغربی فلموں کی نمائش اور دوسری اسلام مخالف چیزوں کی اجازت دے چکے ہیں۔ شرک اور بت پرستی اسلام میں سب سے بڑا گناہ ہے لیکن دبئی میں سب سے بڑا مندر بنایا گیا (باقی صفحہ 82 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُوْرَۃُ الْحَآقَّۃِ

آیات ۱ تا ۳۷

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَآقَّۃُ ۙ﴿۱﴾ مَا الْحَآقَّۃُ ۚ﴿۲﴾ وَ مَاۤ اَدْرٰىکَ مَا الْحَآقَّۃُ ؕ﴿۳﴾ کَذَّبَتْ
ثَمُوْدُ وَ عَادٌۢ بِالْقَارِعَۃِ ﴿۴﴾ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُہْلِکُوْا بِالطَّاغِیَۃِ ﴿۵﴾ وَ اَمَّا
عَادٌ فَاُہْلِکُوْا بِرِیْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِیَۃٍ ۙ﴿۶﴾ سَخَّرَہَا عَلَیْہِمْ سَبْعَ لَیَالٍ وَّ
ثَمٰنِیَۃَ اَیَّامٍ ۙ حُسُوْمًا ۙ فَتَرَی الْقَوْمَ فِیْہَا صَرْعٰی ۙ کَاَنَّہُمْ اَعْجَازُ
نَخْلٍ خَاوِیَۃٍ ۚ﴿۷﴾ فَہَلْ تَرٰی لَہُمْ مِّنْۢ بَاقِیَۃٍ ﴿۸﴾ وَ جَآءَ فِرْعَوْنُ وَ
مَنْ قَبْلَہٗ وَ الْمُؤْتَفِکٰتُ بِالْخَاطِئَۃِ ۚ﴿۹﴾ فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّہِمْ
فَاَخَذَہُمْ اَخْذَۃً رَّابِیَۃً ﴿۱۰﴾ اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰکُمْ فِی
الْجَارِیَۃِ ۙ﴿۱۱﴾ لِنَجْعَلَہَا لَکُمْ تَذْکِرَۃً وَّ تَعِیَہَاۤ اُذُنٌ وَّاعِیَۃٌ ﴿۱۲﴾ فَاِذَا
نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَۃٌ وَّاحِدَۃٌ ۙ﴿۱۳﴾ وَّ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ
فَدُکَّتَا دَکَّۃً وَّاحِدَۃً ۙ﴿۱۴﴾ فَیَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَۃُ ۙ﴿۱۵﴾ وَ انْشَقَّتِ
السَّمَآءُ فَہِیَ یَوْمَئِذٍ وَّاہِیَۃٌ ۙ﴿۱۶﴾ وَّ الْمَلَکُ عَلٰۤی اَرْجَآئِہَا ؕ وَ یَحْمِلُ
عَرْشَ رَبِّکَ فَوْقَہُمْ یَوْمَئِذٍ ثَمٰنِیَۃٌ ؕ﴿۱۷﴾ یَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا
تَخْفٰی مِنْکُمْ خَافِیَۃٌ ﴿۱۸﴾ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَہٗ بِیَمِیْنِہٖ ۙ فَیَقُوْلُ
ہَآؤُمُ اقْرَءُوْا کِتٰبِیَہْ ۚ﴿۱۹﴾ اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَہْ ۚ﴿۲۰﴾ فَہُوَ فِیْ
عِیْشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ ۙ﴿۲۱﴾ فِیْ جَنَّۃٍ عَالِیَۃٍ ۙ﴿۲۲﴾ قُطُوْفُہَا دَانِیَۃٌ ﴿۲۳﴾ کُلُوْا

وَ اشْرَبُوْا ہَنِیْٓـًٔۢا بِمَاۤ اَسْلَفْتُمْ فِی الْاَیَّامِ الْخَالِیَۃِ ﴿۲۴﴾ وَ اَمَّا مَنْ
اُوْتِیَ کِتٰبَہٗ بِشِمَالِہٖ ۙ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ کِتٰبِیَہْ ۚ﴿۲۵﴾ وَ لَمْ
اَدْرِ مَا حِسَابِیَہْ ۚ﴿۲۶﴾ یٰلَیْتَہَا کَانَتِ الْقَاضِیَۃَ ۚ﴿۲۷﴾ مَاۤ اَغْنٰی عَنِّیْ
مَالِیَہْ ۚ﴿۲۸﴾ ہَلَکَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَہْ ۚ﴿۲۹﴾ خُذُوْہُ فَغُلُّوْہُ ۙ﴿۳۰﴾ ثُمَّ الْجَحِیْمَ
صَلُّوْہُ ۙ﴿۳۱﴾ ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَۃٍ ذَرْعُہَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُکُوْہُ ؕ﴿۳۲﴾ اِنَّہٗ
کَانَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ الْعَظِیْمِ ۙ﴿۳۳﴾ وَ لَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ
الْمِسْکِیْنِ ؕ﴿۳۴﴾ فَلَیْسَ لَہُ الْیَوْمَ ہٰہُنَا حَمِیْمٌ ۙ﴿۳۵﴾ وَّ لَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ
غِسْلِیْنٍ ۙ﴿۳۶﴾ لَّا یَاْکُلُہٗۤ اِلَّا الْخَاطِـُٔوْنَ ﴿۳۷﴾

آیت ۱ ﴿اَلْحَآقَّۃُ ﴿۱﴾﴾ ’’وہ حق ہو جانے والی!‘‘

یعنی قیامت جس کا وقوع پذیر ہونا حق ہے‘ اس کا واقع ہونا ایک مسلمہ صداقت اور اٹل حقیقت ہے جس میں قطعاً کوئی شک نہیں۔

آیت ۲ ﴿مَا الْحَآقَّۃُ ﴿۲﴾﴾ ’’کیا ہے وہ حق ہو جانے والی؟‘‘

آیت ۳ ﴿وَمَاۤ اَدْرٰىکَ مَا الْحَآقَّۃُ ﴿۳﴾﴾ ’’اور تم نے کیا سمجھا کہ وہ حق ہونے والی کیا ہے؟‘‘

آیت ۴ ﴿کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَۃِ ﴿۴﴾﴾ ’’جھٹلایا تھا ثمود نے بھی اور عاد نے بھی اس کھڑکھڑا دینے والی کو۔‘‘

القَارِعَة سے مراد بھی قیامت ہے۔ قَرَعَ کا معنی ہے ایک سخت چیز کو دوسری چیز سے ٹکرانا‘ کوٹنا‘ ریزہ ریزہ کر دینا‘ کھڑکھڑا دینا‘ یا بہت زور سے کھٹکھٹانا۔ الحَاقّۃ اور القَارِعَة ان دونوں الفاظ کے مابین ایک نسبت یہ بھی ہے کہ یہ دو سورتوں کے نام ہیں اور ان دونوں سورتوں کے آغاز کا انداز بھی ایک جیسا ہے۔ چنانچہ سورۃ القَارِعَة کا آغاز بھی بالکل اسی طرح ہو رہا ہے:

﴿اَلْقَارِعَۃُ ﴿۱﴾ مَا الْقَارِعَۃُ ﴿۲﴾ وَمَاۤ اَدْرٰىکَ مَا الْقَارِعَۃُ ﴿۳﴾﴾

آیت ۵ ﴿فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُہْلِکُوْا بِالطَّاغِیَۃِ ﴿۵﴾﴾ ’’پس ثمود تو ہلاک کر دیے گئے ایک حد سے بڑھ جانے والی آفت سے۔‘‘

الطَّاغِيَة کے لغوی معنی حد سے گزر جانے والی چیز کے ہیں۔ یعنی انتہائی شدّت والی چیز۔ اس کے لیے قرآن حکیم کے مختلف مقامات پر الرَّجفة (زبردست زلزلہ)، الصَّيْحَة (زور کا دھاکہ یا کڑک)، صَاعِقَة (گرج) الفاظ مذکور ہیں، جو عذاب کی مختلف کیفیات کو بیان کرتے ہیں۔

آیت ۶ ﴿وَاَمَّا عَادٌ فَاُهۡلِكُوۡا بِرِيۡحٍ صَرۡصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝۶﴾ ''اور عاد ہلاک کر دیے گئے ایک جھکڑ والی تیز آندھی سے۔''

آیت ۷ ﴿سَخَّرَهَا عَلَيۡهِمۡ سَبۡعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوۡمًا ۙ فَتَرَى الۡقَوۡمَ فِيۡهَا صَرۡعٰى ۙ كَاَنَّهُمۡ اَعۡجَازُ نَخۡلٍ خَاوِيَةٍ ۝۷﴾ ''اللہ نے مسلط کر دیا اسے اُن پر مسلسل سات راتوں اور آٹھ دنوں تک، اُن کی بیخ کنی کے لیے، تو تم دیکھتے اُن لوگوں کو کہ وہاں ایسے پچھڑے پڑے ہیں جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے ہوں۔''

قومِ عاد کے لوگ بہت قد آور تھے، اس لیے انہیں کھجور کے تنوں سے تشبیہہ دی گئی ہے۔

آیت ۸ ﴿فَهَلۡ تَرٰى لَهُمۡ مِّنۡۢ بَاقِيَةٍ ۝۸﴾ ''تو کیا تم ان میں سے کسی کو دیکھتے ہو باقی بچا ہوا؟''

آیت ۹ ﴿وَجَآءَ فِرۡعَوۡنُ وَمَنۡ قَبۡلَهٗ وَالۡمُؤۡتَفِكٰتُ بِالۡخَاطِئَةِ ۝۹﴾ ''اور (اسی طرح) فرعون اور اس سے پہلے والوں نے، اور الٹ دی جانے والی بستیوں (کے باسیوں) نے بھی خطاکاری کی روش اختیار کی تھی۔''

الٹائی جانے والی بستیوں سے مراد قومِ لوط کی بستیاں ہیں۔

آیت ۱۰ ﴿فَعَصَوۡا رَسُوۡلَ رَبِّهِمۡ﴾ ''تو انہوں نے نافرمانی کی اپنے ربّ کے رسول کی''

﴿فَاَخَذَهُمۡ اَخۡذَةً رَّابِيَةً ۝۱۰﴾ ''تو اللہ نے ان کو اپنی سخت گرفت میں دبوچ لیا۔''

آیت ۱۱ ﴿اِنَّا لَمَّا طَغَا الۡمَآءُ حَمَلۡنٰكُمۡ فِى الۡجَارِيَةِ ۝۱۱﴾ ''جب (سیلابِ نوحؑ کا) پانی طغیانی پر آیا تھا تو ہم نے تمہیں سوار کرا لیا تھا کشتی پر۔''

اس سیلاب کے بعد نوعِ انسانی کی نسل حضرت نوح علیہ السلام کے انہی تین بیٹوں سے چلی جو اس

کشتی میں سوار تھے، اس لیے آیت کے اسلوب سے یہ تاثر ملتا ہے جیسے پوری نوعِ انسانی کشتی میں سوار تھی۔

آیت ۱۲ ﴿لِنَجۡعَلَهَا لَكُمۡ تَذۡكِرَةً وَّتَعِيَهَاۤ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ۝۱۲﴾ ''تاکہ ہم اس کو تمہارے لیے ایک یاددہانی بنا دیں اور وہ کان جو حفاظت کرنے والے ہیں اس کو پوری حفاظت سے یاد رکھیں۔''

ان آیات میں ''التَّذْكِير بِاَيَّامِ اللّٰه'' کا بیان تھا۔ اس کے بعد آخرت کا ذکر آ رہا ہے۔ ایک لحاظ سے تو یہ بھی اَیَّام اللّٰہ ہی کے تذکرے کا حصہ ہے، کیونکہ وقت کی ڈور میں ایک طرف اگر گزشتہ اقوام کے عبرت ناک واقعات پروئے ہوئے ہیں تو اسی ڈور کا دوسرا سرا آخرت ہے۔

آیت ۱۳ ﴿فَاِذَا نُفِخَ فِى الصُّوۡرِ نَفۡخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝۱۳﴾ ''تو جب صور میں پھونکا جائے گا یکبارگی۔''

یعنی اُس وقت کو یاد رکھو جب ایک ہی بار صور میں پھونک ماردی جائے گی۔

آیت ۱۴ ﴿وَّحُمِلَتِ الۡاَرۡضُ وَالۡجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۝۱۴﴾ ''اور جب زمین اور پہاڑوں کو اُٹھا کر ایک ہی بار میں پاش پاش کر دیا جائے گا۔''

آیت ۱۵ ﴿فَيَوۡمَئِذٍ وَّقَعَتِ الۡوَاقِعَةُ ۝۱۵﴾ ''تو اُس روز وہ واقعہ رونما ہو جائے گا۔''

آیت ۱۶ ﴿وَانۡشَقَّتِ السَّمَآءُ﴾ ''اور آسمان پھٹ جائے گا''

﴿فَهِىَ يَوۡمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ۝۱۶﴾ ''تو وہ اُس دن بہت بودا سا ہو جائے گا۔''

آیت ۱۷ ﴿وَّالۡمَلَكُ عَلٰٓى اَرۡجَآئِهَا ؕ﴾ ''اور فرشتے ہوں گے اس کے کناروں پر۔''

﴿وَيَحۡمِلُ عَرۡشَ رَبِّكَ فَوۡقَهُمۡ يَوۡمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ۝۱۷﴾ ''اور اُس دن تیرے رب کے عرش کو اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے آٹھ فرشتے۔''

آیت ۱۸ ﴿يَوۡمَئِذٍ تُعۡرَضُوۡنَ﴾ ''اُس دن تمہاری پیشی ہوگی''

﴿لَا تَخۡفٰى مِنۡكُمۡ خَافِيَةٌ ۝۱۸﴾ ''تمہاری کوئی مخفی سے مخفی بات بھی چھپی نہیں رہے گی۔''

آیت ۱۹ ﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ۙ﴾ ”تو وہ شخص جس کو اُس کا اعمال نامہ دیا جائے گا اُس کے داہنے ہاتھ میں“

﴿فَیَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِیَهْ (۱۹)﴾ ”تو وہ کہے گا: آؤ آؤ! دیکھو میرا اعمال نامہ!“

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ! آمین!

آیت ۲۰ ﴿اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ (۲۰)﴾ ”(وہ کہے گا:) مجھے یقین تھا کہ مجھے اپنے حساب سے دوچار ہونا ہے۔“

مجھے یقین تھا کہ مجھے میرے اعمال کا بدلہ ضرور ملے گا۔

آیت ۲۱ ﴿فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ (۲۱)﴾ ”پس وہ پسندیدہ زندگی بسر کرے گا۔“

وہ خوش نصیب دل پسند عیش میں ہوگا۔ اسے ایسی زندگی عطا کی جائے گی جس میں ہر طرح کی رضا ہی رضا ہوگی۔

آیت ۲۲ ﴿فِیْ جَنَّةٍ عَالِیَةٍ (۲۲)﴾ ”بڑے ہی بلند باغ میں۔“

آیت ۲۳ ﴿قُطُوْفُهَا دَانِیَةٌ (۲۳)﴾ ”اس کے خوشے جھکے ہوئے ہوں گے۔“

آیت ۲۴ ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِیْٓـًٔا ۢبِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِی الْاَیَّامِ الْخَالِیَةِ (۲۴)﴾ ”(کہہ دیا جائے گا:) کھاؤ اور پیو رچتا پچتا ان اعمال کے صلے میں جو تم نے گزرے دنوں میں کیے۔“

آیت ۲۵ ﴿وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ﴾ ”اور جس شخص کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا“

﴿فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِیَهْ (۲۵)﴾ ”وہ کہے گا: اے کاش! مجھے میرا اعمال نامہ دیا ہی نہ گیا ہوتا۔“

ع ”مرا اے کاش کہ مادر نہ زادے“ کاش! میری ماں نے مجھے جنا ہی نہ ہوتا!

آیت ۲۶ ﴿وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِیَهْ (۲۶)﴾ ”اور مجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے!“

آیت ۲۷ ﴿یٰلَیْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِیَةَ (۲۷)﴾ ”اے کاش کہ وہی موت قصہ پاک کر دینے والی ہوتی!“

کاش کہ وہی موت جو مجھے دنیا میں آئی تھی فیصلہ کن ہوتی‘ اُس موت کے بعد میں معدوم ہوگیا ہوتا اور میرے دوبارہ زندہ ہونے کی نوبت نہ آتی۔

آیت ۲۸ ﴿مَآ اَغْنٰی عَنِّیْ مَالِیَهْ (۲۸)﴾ ”میرا مال و اسباب کچھ بھی میرے کام نہ آیا۔“

آیت ۲۹ ﴿هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ (۲۹)﴾ ”میرا اقتدار بھی مجھ سے چھن گیا۔“

میرے دُنیوی اختیار و اقتدار اور میری شان و شوکت میں سے کچھ بھی باقی نہ بچا‘ سب کچھ نیست و نابود ہوگیا۔ ایسے ہر شخص کے لیے فرشتوں کو حکم دیا جائے گا:

آیت ۳۰ ﴿خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ (۳۰)﴾ ”پکڑو اسے اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو!“

آیت ۳۱ ﴿ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْهُ (۳۱)﴾ ”پھر اسے جہنم کے اندر جھونک دو!“

آیت ۳۲ ﴿ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ (۳۲)﴾ ”پھر ایک زنجیر میں اس کو باندھ دو جس کا طول ستر گز ہے۔“

آیت ۳۳ ﴿اِنَّهٗ كَانَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِیْمِ (۳۳)﴾ ”یہ اللہ پر ایمان نہیں رکھتا تھا جو عظمت والا ہے۔“

آیت ۳۴ ﴿وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ (۳۴)﴾ ”اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا۔“

اسے خود تو کسی مسکین کو کھانا کھلانے کی کبھی توفیق نہیں ہوئی‘ کسی دوسرے شخص کو بھی اس نے بھلائی کے اس کام کی کبھی ترغیب نہیں دی۔

آیت ۳۵ ﴿فَلَیْسَ لَهُ الْیَوْمَ هٰهُنَا حَمِیْمٌ (۳۵)﴾ ”تو اس کے لیے یہاں کوئی گرم جوش دوست نہیں ہے۔“

آیت ۳۶ ﴿وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِیْنٍ (۳۶)﴾ ”اور نہ ہی کچھ کھانے کو ہے سوائے زخموں کے دھوون کے۔“

آیت ۳۷ ﴿لَّا یَاۡکُلُہٗۤ اِلَّا الۡخَاطِـُٔوۡنَ ﴿۳۷﴾﴾ ''نہیں کھائیں گے اس کو مگر وہی جو خطا کار تھے۔''

آیات ۳۸ تا ۵۲

فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِمَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۳۸﴾ وَ مَا لَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّہٗ لَقَوۡلُ
رَسُوۡلٍ کَرِیۡمٍ ﴿۴۰﴾ وَّ مَا ہُوَ بِقَوۡلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۴۱﴾ وَ
لَا بِقَوۡلِ کَاہِنٍ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۴۲﴾ تَنۡزِیۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ
الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۳﴾ وَ لَوۡ تَقَوَّلَ عَلَیۡنَا بَعۡضَ الۡاَقَاوِیۡلِ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذۡنَا مِنۡہُ
بِالۡیَمِیۡنِ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعۡنَا مِنۡہُ الۡوَتِیۡنَ ﴿۴۶﴾ فَمَا مِنۡکُمۡ مِّنۡ اَحَدٍ عَنۡہُ
حٰجِزِیۡنَ ﴿۴۷﴾ وَ اِنَّہٗ لَتَذۡکِرَۃٌ لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۴۸﴾ وَ اِنَّا لَنَعۡلَمُ اَنَّ مِنۡکُمۡ
مُّکَذِّبِیۡنَ ﴿۴۹﴾ وَ اِنَّہٗ لَحَسۡرَۃٌ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۵۰﴾ وَ اِنَّہٗ لَحَقُّ
الۡیَقِیۡنِ ﴿۵۱﴾ فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الۡعَظِیۡمِ ﴿۵۲﴾

سورۃ الحاقہ کے دوسرے رکوع کی سورۃ الواقعہ کے آخری رکوع سے گہری مشابہت ہے۔ چنانچہ اگلی آیات کو پڑھتے ہوئے سورۃ الواقعہ کی ان آیات کو بھی ذہن میں تازہ کر لیجیے: ﴿فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوۡمِ ﴿۷۵﴾ وَ اِنَّہٗ لَقَسَمٌ لَّوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عَظِیۡمٌ ﴿۷۶﴾ اِنَّہٗ لَقُرۡاٰنٌ کَرِیۡمٌ ﴿۷۷﴾﴾ ''تو نہیں! قسم ہے مجھے ان مقامات کی جہاں ستارے ڈوبتے ہیں۔ اور یقیناً یہ بہت بڑی قسم ہے اگر تم جانو! یقیناً یہ بہت عزّت والا قرآن ہے۔''

آیت ۳۸ ﴿فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِمَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۳۸﴾﴾ ''تو میں قسم کھاتا ہوں اُس کی جو تم دیکھتے ہو۔''

آیت ۳۹ ﴿وَ مَا لَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۳۹﴾﴾ ''اور اُس کی بھی جو تم نہیں دیکھتے ہو۔''

آیت ۴۰ ﴿اِنَّہٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ کَرِیۡمٍ ﴿۴۰﴾﴾ ''یہ قول ہے ایک رسولِ کریم کا۔''

اصل میں تو یہ اللہ کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ سے حضرت جبرائیلؑ نے سنا۔ پھر حضرت جبرائیل سے حضرت محمد ﷺ نے سنا اور اب وہ لوگوں کو سنا رہے تھے۔ چنانچہ ایک لحاظ سے یہ جبرائیلؑ کا قول تھا اور دوسرے لحاظ سے حضور ﷺ کا قول۔

آیت ۴۱ ﴿وَّ مَا ہُوَ بِقَوۡلِ شَاعِرٍ ؕ﴾ ''اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔''

﴿قَلِیۡلًا مَّا تُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۴۱﴾﴾ ''کم ہی ہے جو تم یقین کرتے ہو۔''

آیت ۴۲ ﴿وَ لَا بِقَوۡلِ کَاہِنٍ ؕ﴾ ''اور نہ ہی یہ کسی کاہن کا کلام ہے۔''

﴿قَلِیۡلًا مَّا تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۴۲﴾﴾ ''کم ہی ہے جو تم غور کرتے ہو۔''

آیت ۴۳ ﴿تَنۡزِیۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۳﴾﴾ ''اس کا اتارا جانا ہے تمام جہانوں کے رب کی طرف سے۔''

یہ آیت جوں کی توں سورۃ الواقعہ (آیت ۸۰) میں بھی ہے۔

آیت ۴۴ ﴿وَ لَوۡ تَقَوَّلَ عَلَیۡنَا بَعۡضَ الۡاَقَاوِیۡلِ ﴿۴۴﴾﴾ ''اور (بالفرض) اگر یہ (نبی ﷺ) خود گھڑ کر بعض باتیں ہماری طرف منسوب کر دیتے۔''

تَقَوَّلَ باب تفعّل ہے، اس باب میں تکلف کے معنی پائے جاتے ہیں، یعنی ارادے، محنت اور کوشش سے کوئی بات کہنا۔

آیت ۴۵ ﴿لَاَخَذۡنَا مِنۡہُ بِالۡیَمِیۡنِ ﴿۴۵﴾﴾ ''تو ہم پکڑتے ان کو داہنے ہاتھ سے۔''

اس فقرے کے مفہوم میں دو امکانات ہیں۔ ایک یہ کہ ہم اپنے دائیں ہاتھ سے انہیں پکڑتے، یا یہ کہ ہم انہیں ان کے داہنے ہاتھ سے پکڑتے۔

آیت ۴۶ ﴿ثُمَّ لَقَطَعۡنَا مِنۡہُ الۡوَتِیۡنَ ﴿۴۶﴾﴾ ''پھر ہم ان کی گردن کاٹ ڈالتے۔''

اس اسلوب اور لہجے میں جو سختی ہے یہ دراصل اُن لوگوں کے لیے ہے جو قرآن کو کلام اللہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھے اور کہتے تھے کہ محمد (ﷺ) خود اپنی طرف سے باتیں بنا کر اللہ کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ انہیں بتایا جا رہا ہے کہ بدبختو! تم ہمارے رسول کریم ﷺ کے مرتبے کو کیا سمجھو! کسی رسول کا یہ مقام نہیں ہے کہ وہ اپنے رب کے کلام میں اپنی طرف سے کوئی ملاوٹ کرے۔ وہ تم لوگوں تک ٹھیک ٹھیک وہی کچھ پہنچا رہے ہیں جو ہمارا کلام ہے۔ بفرضِ محال اگر وہ اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ کر ہماری طرف منسوب کر دیں تو یہ کوئی معمولی سا جرم نہیں ہے جس کا نوٹس نہ لیا جائے۔

آیت ۴۷ ﴿فَمَا مِنۡکُمۡ مِّنۡ اَحَدٍ عَنۡہُ حٰجِزِیۡنَ ﴿۴۷﴾﴾ ''پھر تم میں سے کوئی بھی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔''

آیت ۴۸ ﴿ وَاِنَّهٗ لَتَذۡكِرَةٌ لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ﴾ ’’اور یقیناً یہ تو ایک یاد دہانی ہے متقین کے لیے۔‘‘

یہ کلام اُن لوگوں کے لیے نصیحت ہے جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور نیکی و بدی میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

آیت ۴۹ ﴿ وَاِنَّا لَنَعۡلَمُ اَنَّ مِنۡكُمۡ مُّكَذِّبِيۡنَ ﴾ ’’اور ہمیں خوب معلوم ہے کہ تم میں کچھ لوگ جھٹلانے والے بھی ہیں۔‘‘

وہ ہمارے کلام کو جھٹلانے پر کمر بستہ ہو چکے ہیں کہ جو چاہے ہو وہ اسے اللہ کا کلام نہیں مانیں گے۔

آیت ۵۰ ﴿ وَاِنَّهٗ لَحَسۡرَةٌ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ﴾ ’’اور یقیناً یہ کافروں کے لیے حسرت کا باعث بن جائے گا۔‘‘

ایک وقت آئے گا جب قرآن ان جھٹلانے والوں کے لیے حسرت اور پچھتاوے کا سبب بن جائے گا۔ حضورﷺ کا فرمان ہے: ((اَلْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَکَ اَوْ عَلَیْکَ))[1] کہ یہ قرآن حُجت ہے تمہارے حق میں یا تمہارے خلاف۔ اگر تو تم اس کے حقوق ادا کرو گے‘ اس پر ایمان لاؤ گے‘ اسے اپنا امام بنا کر اس کے پیچھے چلو گے اور اس کا پیغام دوسروں تک پہنچانے کا اہتمام کرو گے تو یہ قیامت کے دن تمہاری شفاعت کرے گا‘ اور اگر تم اس کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرو گے تو قیامت کے دن یہ تمہارے خلاف گواہ بن کر کھڑا ہو گا۔

آیت ۵۱ ﴿ وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الۡيَقِيۡنِ ﴾ ’’اور یقیناً یہ (قرآن) بالکل یقینی حق ہے۔‘‘

یہ ایسا یقین ہے جو سراسر حق ہے‘ جس میں باطل کی ذرا ملاوٹ تک نہیں۔

آیت ۵۲ ﴿ فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الۡعَظِيۡمِ ﴾ ’’پس آپ تسبیح کیجیے اپنے رب کے نام کی جو کہ بہت عظمت والا ہے۔‘‘

نوٹ کیجیے‘ سورۃ الواقعہ کا اختتام بھی اسی آیت پر ہوتا ہے۔ ۞۞۞

۱۔ صحیح مسلم‘ کتاب الطھارۃ‘ باب فضل الوضوء۔ وسنن الترمذی‘ کتاب الدعوات‘ باب منہ۔

جُدا ہو دیں سیاست سے......!

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد ؒ ملکی سیاسی معاملات پر گہری نظر رکھتے تھے اور ان کے بارے میں ''میثاق'' کے اداریوں اور اپنے خطابات میں گاہے بگاہے اظہارِ خیال فرماتے رہتے تھے۔ ۲ جون ۱۹۹۳ء کو مسجد دار السلام باغِ جناح لاہور میں ڈاکٹر صاحبؒ نے دین وسیاست کے بارے میں اپنا موقف نہایت معیّن اور دوٹوک انداز میں بیان کیا کہ سیاست میں حصّہ لینا ان کے نزدیک حرام ہے یا فرض و واجب؟ کیا پاکستان کو ایک اسلامی ریاست قرار دیا جا سکتا ہے؟ اور اگر نہیں تو اس کے سیاسی امور کے ضمن میں ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے؟ وغیرہ۔ پھر قرآن اکیڈمی کراچی میں ۹ جون کے خطابِ جمعہ میں یہ موضوع زیرِ گفتگو رہا اور پھر قدرے تفصیل سے اس پر ۱۶ جون کو لاہور کے اجتماعِ جمعہ میں مزید گفتگو ہوئی۔ ان تینوں خطابات کو یکجا مرتب کر کے جولائی ۱۹۹۳ء کے میثاق میں ''پاکستان کی موجودہ سیاست اور تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت کا موقف'' کے عنوان سے شائع کر دیا گیا تھا تا کہ امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت کا موقف پوری وضاحت کے ساتھ رفقاء واحباب کے سامنے آسکے۔

سالانہ اجتماع ۲۰۲۲ء میں امیر تنظیم اسلامی جناب شجاع الدین شیخ حفظہ اللہ کی جانب سے رفقاءِ تنظیم کو جو اہداف دیے گئے ان میں بانی محترمؒ کے اس خطاب کا مطالعہ بھی شامل ہے۔ چنانچہ یہ فکر انگیز خطاب میثاق میں ''قندِ مکرر'' کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔

معزز حاضرین ومحترم خواتین!

یہ بڑی غیر معمولی سی بات ہے کہ آج ہم نے خطابِ جمعہ کے لیے خالص سیاسی عنوان معیّن کیا ہے: ''پاکستان کی موجودہ سیاست اور تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت کا موقف!'' اس کا سبب یہ ہے کہ بالعموم میرا خطابِ جمعہ اصلاً تو قرآن مجید کی آیات کے حوالے سے مختلف دینی

موضوعات پر مشتمل ہوتا ہے لیکن آخر میں اختصار کے ساتھ ملکی حالات کا جائزہ لیا جاتا ہے اور ان پر تبصرہ ہوتا ہے' کیونکہ اپنے ملکی وملی معاملات سے بھی ہم بالکل صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔ اس طرح کم وقت میں اختصار کے ساتھ اور جلدی میں جو بات کہی جاتی ہے وہ پورے طور پر واضح نہیں ہوتی۔ چنانچہ ہمارے بہت سے بہی خواہ' متفقین اور معاونین حضرات بھی کچھ اُلجھ جاتے ہیں اور بہت سے پرانے رفقاء کی سمجھ میں بھی بات پورے طور پر نہیں آتی۔ پھر ظاہر بات ہے کہ مخالفین کو تو ایسا موقع مطلوب ہوتا ہے کہ ایسی کوئی صورت ہو جس کو وہ اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکیں۔ لہٰذا میری خواہش یہ ہے کہ آج اس موضوع پر اپنا نقطۂ نظر پورے دلائل کے ساتھ' نپے تلے الفاظ میں ذرا تفصیل سے پیش کر دوں' تا کہ اس ضمن میں ہمارا جو موقف ہے اس کا نہ صرف یہ کہ صُغریٰ کُبریٰ پوری طرح واضح ہو جائے' بلکہ جیسا کہ سورۃ الانفال کی آیت ۸ میں الفاظ آئے ہیں: ﴿لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ﴾ ''تا کہ اللہ حق کا حق ہونا ثابت کر دے اور باطل کا باطل ہونا واضح کر دے'' اسی طرح ہمارا موقف بھی پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آجائے۔ پھر جسے اس سے اختلاف ہو وہ علیٰ وجہ البصیرت اختلاف کرے' کسی مغالطے یا غلط فہمی کی بنا پر نہ کرے۔ اس لیے کہ اختلاف تو ہر حال میں ہو سکتا ہے' ہر شخص کی رائے کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ مَیں اگر دوسروں کی آراء سے اختلاف کرتا ہوں تو دوسروں کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ مجھ سے اختلاف کریں۔ لیکن وہ اختلاف وضاحت کے ساتھ ہو کہ آپ کی فلاں بات کو ہم درست نہیں سمجھتے' لہٰذا اس سے ہمیں اختلاف ہے۔

سورۃ الانفال ہی کی آیت ۴۲ میں الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ؕ﴾ ''تا کہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ حجت قائم ہونے کے بعد ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل کے ساتھ زندہ رہے''۔ یعنی جسے ہلاک ہی ہونا ہے وہ بھی بات کے واضح ہونے کے بعد' جانتے بوجھتے ہلاک ہو۔ وہ اگر حق کو قبول نہیں کرنا چاہتا تو بھی یہ بات اس پر منکشف ہو جائے کہ حق تو یہ ہے' مَیں اگر اسے قبول نہیں کر رہا تو اپنے تمرّد' اپنے تکبر' اپنی سرکشی اور اپنے حسد کی وجہ سے نہیں کر رہا۔ اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل کے ساتھ زندہ رہے۔ یعنی جسے اتفاق کرنا ہو وہ بھی علیٰ وجہ البصیرت اتفاق کرے' مبہم سا اتفاق نہ ہو۔ جسے بات قبول کرنی ہے وہ محض اس وجہ سے قبول نہ کرے کہ چونکہ فلاں شخص کی بات ہے' لہٰذا قبول کر رہا ہوں' فلاں سے

مجھے محبت ہے اس لیے اس کی تو ہر بات میرے لیے واجب الاطاعت ہے۔ یوں نہیں‘ بلکہ جس شے کو قبول کرے دلیل کی بنیاد پر اور علیٰ وجہ البصیرت قبول کرے۔ مبہم اور غیر واضح اتفاق اشتراکِ عمل کو جنم نہیں دیتا۔ واضح اتفاق ہو تو پھر آدمی صحیح طور پر ساتھ دیتا ہے‘ ہم سفر بنتا ہے‘ دست و بازو بنتا ہے‘ انصار و اعوان میں شریک ہوتا ہے۔ اسی اعتبار سے مَیں نے ان آیات کا حوالہ دیا ہے۔

تاہم یہ نہ سمجھیے کہ میری یہ گفتگو خالص سیاسی ہوگی‘ بلکہ فی الاصل یہ دینی گفتگو ہے۔ صرف ترتیب بدل جائے گی کہ پہلے ہم دینی نصوص‘ قرآن و سُنّت سے بات شروع کر کے اسے ملکی حالات تک پہنچاتے تھے‘ آج ترتیب برعکس ہوگی‘ لیکن بات وہی رہے گی۔ حق تو ایک حقیقتِ واحدہ ہے‘ اس میں آپ کسی بھی دروازے سے داخل ہو جائیں‘ کسی بھی ترتیب سے رسائی حاصل کر لیں‘ وہ تو حق ہی ہے۔

دین اور سیاست

اس تمہید کے بعد جو سب سے پہلی بات مَیں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ سیاست کے بارے میں ہمارا موقف کیا ہے۔ آیا سیاست کا دین سے کوئی تعلق ہے یا نہیں ہے؟ سیاست میں حصہ لینا گناہ ہے؟ یا واجب یا فرض ہے؟ اس بارے میں ہمیں پورے طور سے صحیح رائے قائم کرنی چاہیے۔ چنانچہ اس کے ضمن میں مَیں پانچ باتیں عرض کروں گا۔

پہلی بات یہ کہ اسلام میں سیاست شجرِ ممنوعہ نہیں‘ یہ کوئی گناہ یا معصیت کا کام نہیں‘ بلکہ اسلام چونکہ دین ہے اور مذہب و سیاست دونوں کا جامع ہے‘ اس لیے سیاست اسلام کا جزوِ لاینفک ہے۔ یہ اس کا لازمی حصہ ہے جو اس سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس فکر کو ازسرِنو علامہ اقبال نے جس قوت سے پیش کیا اس پر ہم ان کے ممنونِ احسان ہیں۔ چنانچہ اس حقیقت کی انہوں نے ان دو اشعار میں بہت صحیح تعبیر کی ہے کہ ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اور ؎

ہوئی دین و دولت میں جس دم جُدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری

اسلام میں تو دین و دولت ایک ہیں‘ مذہب و سیاست ایک ہیں۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک سیاست کوئی دنیاداری کا فعل نہیں ہے بلکہ یہ تو دین کا جزو ہے۔ ہمارے نزدیک تو مسلمانوں کے زوال اور اضمحلال کا سب سے بڑا مظہر ہی یہ ہے کہ سیاست اور مذہب علیحدہ ہو گئے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد سے تدریجاً یہ علیحدگی شروع ہوئی اور چند صدیوں کے اندر اندر بالکل علیحدہ علیحدہ خانے بن گئے کہ یہ اہل سیاست و حکومت ہیں اور یہ رجالِ دین ہیں۔ بعد میں اہلِ دین میں مزید تقسیم ہوگئی کہ یہ علماء ہیں اور یہ صوفیاء ہیں۔ اس طرح عالَمِ اسلام میں قیادت کی تثلیث قائم ہوگئی۔ اقبال نے اپنے اس شعر میں اسی تثلیث کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری!

چنانچہ مسلمانوں کی قیادت تین حصوں میں منقسم ہوگئی۔ ایک طرف مُلّا یعنی علماء‘ دوسری طرف پیر یعنی صوفیاء اور تیسری طرف بادشاہ یعنی سلاطین و ملوک۔ یوں یہ تثلیث وجود میں آ گئی‘ جبکہ توحید کا تقاضا یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں یکجا ہوں‘ جیسا کہ خلافت راشدہ کے دور میں تھا۔ مسلمانوں کی قیادت حضرت ابوبکر صِدّیق ؓ کے ہاتھ میں تھی تو وہ ایک بہت بڑے عالم بھی تھے‘ وہی مسجد نبوی کے خطیب اور امام تھے اور وہی مسلمانوں کے سیاسی سربراہ یعنی امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین بھی تھے۔

دوسری بات یہ کہ اگر اسلامی ریاست بالفعل موجود ہو‘ اسلام کا نظامِ اجتماعی عملاً قائم ہو تو اس کی سیاست نہ صرف عبادت بلکہ کارِ نبوت ہے۔ یہ بات مَیں بغیر دلیل کے نہیں کہہ رہا ہوں۔ میرے ہر دعوے کی دلیل میرے پاس موجود ہے۔ میری دو آنکھیں اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول ﷺ کے فرامین ہیں۔ حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((كَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهٗ نَبِيٌّ))
(متفق علیہ)

یعنی بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء کے ہاتھوں میں تھی‘ جیسے ہی کوئی نبی فوت ہوتا تھا تو اس کا جانشین بھی نبی ہوتا تھا۔ چنانچہ سابقہ اُمّتِ مُسلمہ یعنی بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ ؑ سے لے

کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک نبوت کا یہ تار ٹوٹا ہی نہیں۔ یہ چودہ سو برس ایسے ہیں کہ دنیا میں ایک ہی نسل میں نبوت کا سلسلہ چلتا رہا اور ہر وقت ایک نہ ایک نبی ان کے مابین موجود رہا۔ پھر اس میں سیاست اور نبوت کا جو امتزاج ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ وقت کا نبی ہی ان کا سربراہ ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ جب حکومت قائم ہو گئی تو حضرت داؤد علیہ السلام نبی بھی تھے اور بادشاہ اور خلیفہ بھی تھے۔ پھر ان کے وارث ہوئے حضرت سلیمان علیہ السلام‘ تو وہ بھی نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی تھے۔ یہاں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نبوت اور سیاست‘ یعنی بادشاہت اور نبوت گویا ایک جسدِ واحد بن گئے۔ لہٰذا اسلامی ریاست کی سیاست محض عبادت ہی نہیں‘ کارِ نبوت ہے۔

اس سے آگے بڑھ کر تیسری بات یہ کہ غیر اسلامی نظامِ حکومت میں بھی کسی مسلمان کا‘ اُس کی طلب کے بغیر‘ مقتدر یا مقتدرین کی جانب سے حکومت کے کسی منصب کی پیشکش پر اس منصب کو قبول کرنا جائز ہی نہیں بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ ایک استثنائی صورت ہے جس کی مثال سُنّتِ یوسفی علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام ہے۔ مصر میں اُس وقت اسلامی نظام قائم نہیں تھا۔ نہ وہاں کے لوگ آپؑ پر ایمان لائے تھے اور نہ بادشاہِ وقت‘ لیکن وہ حضرت یوسف علیہ السلام کا معتقد ہو گیا تھا کہ یہ بہت نیک آدمی ہے‘ پاک دامن ہے‘ اس پر جو الزام لگا تھا جھوٹا ثابت ہوا‘ اسے ناحق جیل میں ڈالا گیا‘ پھر اتنا ذہین وفطین اور سمجھ دار انسان ہے کہ اس نے میرے خواب کی نہ صرف صحیح صحیح تعبیر بتادی اور متنبہ کر دیا کہ کتنی بڑی مصیبت آنے والی ہے‘ سات سال کا عظیم قحط پڑنے والا ہے‘ بلکہ اس سے بچاؤ کا طریقہ بھی بتا دیا‘ تو بادشاہ جو مقتدرِ مطلق تھا‘ وہ ذاتی طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کا معتقد ہو گیا‘ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے وہاں عوام کی بہبود کی خاطر ایک عہدہ قبول کر لیا۔ اس سے مَیں جو نتیجہ نکال رہا ہوں وہ یہ ہے کہ اس قسم کے استثنائی حالات میں غیر اسلامی نظامِ حکومت میں کوئی عہدہ قبول کر لینا قطعاً حرام نہیں ہے۔ لیکن اس کے لیے چند شرطیں ہیں‘ مثلاً اس کے لیے آپ نے نہ صرف یہ کہ کوئی جوڑ توڑ اور سازش نہ کی ہو بلکہ خود کوئی جِدّوجہد نہ کی ہو۔ اس کے برعکس جو مقتدر شخص یا لوگ ہوں وہ خود آپ سے متاثر ہو کر پیشکش کریں کہ آیئے‘ یہ منصب سنبھالیے۔ پھر معاملہ بھی کسی قومی یا اجتماعی مسئلے سے متعلق ہو‘ عوام کی بہبود کا ہو‘ کہ اگر اس معاملے کو صحیح طور پر حل نہ کیا گیا تو قیامت واقع ہو جائے گی‘ ملک برباد ہو جائے گا اور لاکھوں انسان فاقوں سے مر جائیں گے۔ اس طرح کی صورتِ حال میں حضرت

یوسف علیہ السلام نے وہ منصب سنبھال کر اس طرح کا بندوبست کیا کہ خوشحالی کے سات سالوں میں غلہ ذخیرہ کیا جو قحط سالی کے سات سالوں میں کام آیا۔ چنانچہ اس طرح کے استثنائی حالات میں غیر اسلامی حکومت میں بھی کوئی ذمہ داری قبول کر لینا جائز ہے۔

چوتھی بات یہ کہ اگر نظامِ حکومت غیر اسلامی ہو تو اقتدار کی رسہ کشی میں شریک ہو کر‘ اس کے لیے خود جدّوجُہد کر کے اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرنا میرے نزدیک ناجائز ہی نہیں حرام کے درجے میں ہے۔ یہاں ’’حرام‘‘ کا لفظ مَیں فقہی اعتبار سے نہیں‘ بلکہ اس کی حقیقی روح کے اعتبار سے استعمال کر رہا ہوں۔ یہ چیز کسی بھی درجے میں اسلام میں پسندیدہ نہیں ہو سکتی۔ فقہی اعتبار سے بھی اگر اس کا جائزہ لیا جائے تو چاہے حرامِ مطلق نہ ہو‘ مکروہِ تحریمی تو قرار پائے گی۔ خاص طور پر جبکہ اس کے لیے کچھ جوڑ توڑ بھی کرنے پڑیں‘ اپنے اصولوں کی قربانی بھی دینی پڑے‘ بہت سے اصولوں پر مفاہمت اور compromise بھی کرنا پڑے‘ بہت کچھ اونچ نیچ بھی کرنی پڑے‘ کوئی دائیں بائیں کے حربے بھی اختیار کرنے پڑیں تو یوں سمجھئے کہ اس میں خباثت پر خباثت کا اضافہ ہو گیا‘ لہٰذا یہ حرام در حرام ہے۔ اور اس کی حرمت کا فتویٰ عالم عرب کے بہت سے علماء نے دیا ہے۔ اس کے لیے ان کے پاس دلیل یہ ہے کہ اگر نظامِ حکومت غیر اسلامی ہے تو دستور بھی غیر اسلامی ہو گا۔ اب اگر کوئی شخص الیکشن لڑ کر پارلیمنٹ میں جاتا ہے تو سب سے پہلے اُسے اس غیر اسلامی دستور کا حلف اٹھانا پڑے گا اور غیر اسلامی دستور کا حلف اٹھانا حرام ہے۔ ویسے تو ایک عام شہری جو غیر اسلامی دستور والے ملک میں رہتا ہے وہ بھی ایک اعتبار سے گناہ گار ہے‘ لیکن وہ اس طرح کھڑا ہو کر حلف نہیں اٹھاتا جس طریقے سے وزراء اور ارکانِ اسمبلی دستور سے وفاداری کا حلف استوار کرتے ہیں۔

پانچویں بات یہ کہ اسلامی ریاست میں‘ عوام کی بہبود کے لیے‘ نظامِ مملکت کو بہتر طور پر چلانے کے لیے‘ یا اسلام کی خدمت کے لیے‘ انتخابات میں حصّہ لینا اور آگے بڑھ کر ذمہ داریاں سنبھالنا یقیناً ناجائز نہیں ہے بلکہ یہ تو کارِ ثواب اور کارِ عبادت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی اصولی طور پر واضح رہنی چاہیے کہ اپنی ذات کے لیے اقتدار کی خواہش کرنا قطعاً حرام ہے۔ اس کا تعلق انسان کی نیت سے ہے جس کا فیصلہ مَیں اور آپ نہیں کر سکتے۔ تاہم اپنی ذات کے لیے اقتدار کی خواہش اور سربلندی کی طلب نصِ قرآنی کی رو سے حرام ہے۔ فرمایا گیا:

﴿ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا

فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿٨٣﴾ (القصص)

’’یہ آخرت کا گھر (یعنی جنت) تو ہم نے اُن لوگوں کے لیے مخصوص کر رکھا ہے جو نہ تو زمین میں اپنے لیے سربلندی (اقتدار و اختیار) کے طالب ہوتے ہیں اور نہ فتنہ وفساد کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اور عاقبت تو ہے ہی پرہیزگاروں کے لیے۔‘‘

اس لیے کہ یہ طلبِ حکومت اور طلبِ اقتدار ہی ہے جو فساد پیدا کرتی ہے۔ فتنہ وفساد درحقیقت اقتدار کی کشاکش یا پاور پالیٹکس ہی سے جنم لیتا ہے‘ جبکہ آخرت کا گھر تو مخصوص ہی اُن لوگوں کے لیے ہے جو اس میدان میں قدم ہی نہ رکھیں۔ البتہ جیسا کہ مَیں نے عرض کیا کہ اگر نیت عوام کی بہبود کی ہو تو پھر حکومتی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے تگ و دو کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کسی دور میں جو یہ کہا گیا کہ ’’امیدواری حرام ہے‘‘ تو میرے نزدیک یہ بھی شدّت پسندی ہے۔ اصل میں امیدواری کا معاملہ انسان کی نیت پر منحصر ہے۔ اگر انسان کی نیت یہ ہو کہ مَیں اسلام کی خدمت کے لیے‘ عوام کی بہبود کے لیے اور اسلامی نظام کو بہتر انداز سے چلانے کے لیے ذِمہ داری قبول کرتا ہوں تو اس میں حرام والی کوئی بات نہیں۔ البتہ یہ واضح رہے کہ یہاں بات اسلامی ریاست کی ہو رہی ہے‘ یعنی وہ جگہ جہاں اسلامی نظام پہلے سے قائم ہو۔

پاکستان کے معروضی حالات

سیاست کے بارے میں پانچ بنیادی نکات کی صراحت کے بعد اب ہمیں پاکستان کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر معیّن کرنا ہوگا کہ اس تناظر میں پاکستان کی حقیقت کیا ہے۔ یہاں بھی پانچ ہی باتیں مدِّنظر رکھنی ہوں گی۔

پہلی بات یہ کہ پاکستان ایک مسلمان ملک تو ہے‘ اسلامی ریاست ہرگز نہیں ہے۔ اسے اسلامی ریاست بنانے کا مرحلہ ابھی باقی ہے۔ تحریک پاکستان کے دنوں میں مولانا مودودی مرحوم نے یہ بات بڑے زوردار انداز میں کہی تھی کہ تم ایک ’’قومی تحریک‘‘ لے کر چل رہے ہو جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی ’’قومی ریاست‘‘ تو قائم ہو جائے گی‘ ایک ’’اسلامی ریاست‘‘ ہرگز قائم نہیں ہوگی۔ اور آج کی تاریخ تک تو ہم نے مولانا مرحوم کے اس قول کو صحیح ثابت کیا ہے۔

اُس وقت ایک رائے یہ تھی کہ اگر مسلمانوں کی اکثریت کا ملک وجود میں آ جائے تو وہاں پر اسلامی ریاست قائم کرنا آسان ہوگا۔ اب مستقبل میں تو شاید کہ ہم یہ کر گزریں اور اس

طرح تحریک پاکستان کا موقف درست ہو جائے گا‘ لیکن تا حال تو یہ بات پوری طرح صحیح ہے کہ مسلمانوں کی ایک قومی ریاست تو وجود میں آ گئی ہے مگر اس پر ’’اسلامی ریاست‘‘ کا لیبل چسپاں کرنا کسی بھی اعتبار سے درست نہیں! یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ دنیا میں اس وقت پچاس ساٹھ مسلمان ممالک ہیں جہاں نام کے مسلمان یقیناً اکثریت میں ہیں‘ لیکن ان میں سے کسی ایک کو بھی اسلامی ریاست نہیں کہا جا سکتا۔

دیگر مسلم ممالک کی طرح پاکستان بھی مسلمانوں کا ملک تو ہے‘ لیکن اسلامی ریاست نہیں ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے‘ مسجدیں محفوظ ہیں اور ایودھیا کی بابری مسجد کی طرح یہاں کوئی مسجد گرائی نہیں جا سکتی‘ لیکن اسلامی نظام یہاں قائم نہیں۔ بلکہ نظام تو بہت بڑی بات ہے‘ یہاں کے قوانین تک اسلامی نہیں ہیں اور اسلامی حدود و تعزیرات تک نافذ نہیں ہیں۔ یہاں چوری کرنے پر کسی کا ہاتھ نہیں کاٹا جاتا‘ زانی کو سنگسار نہیں کیا جاتا‘ کوڑے نہیں لگائے جاتے‘ نہ نظامِ صلوٰۃ قائم ہے اور نہ وہ نظامِ زکوٰۃ کہ جس میں تمام اموالِ ظاہرہ پر زکوٰۃ لازماً وصول کی جائے اور ہر شہری کی بنیادی ضروریات اور معاشی کفالت کا ذمہ لیا گیا ہو۔ آپ خود ہی فیصلہ کیجیے کہ جس نظامِ معیشت کے رگ و پے اور ریشے ریشے میں سود سرایت کیے ہوئے ہو‘ کیا اسے اسلامی نظام کہیں گے؟ —— پھر حقیقت یہ ہے کہ ہمارا قومی مزاج بھی سیکولر ہے۔ مَیں صرف لیڈروں یا سرمایہ داروں کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا رہا‘ بلکہ معاشرے کا عام رجحان سیکولر ہے‘ ہمارے عوام کی اکثریت کا مزاج بھی سیکولر ہے۔ وہ مذہب کو نماز روزے تک محدود رکھتے ہیں‘ باقی کاروبارِ دنیوی میں حلال وحرام کی پروا کسی کو بھی نہیں ہے۔

قومی مزاج کے سیکولر ہونے کی شہادت حاصل کرنی ہو تو ہر شخص اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ لے۔ ایک طرف ہمارے ایمان کی سطح اتنی نیچی ہے کہ صرف عقیدہ ہے‘ ایمان نہیں۔ ہر شخص سوچ لے کہ ایک طرف ایمان ہو اور دوسری طرف مفاد ہو تو وہ کدھر جائے گا‘ مفاد کو ترجیح دے گا یا ایمان کو؟ یہ اُس کے ایمان کا لٹمس ٹیسٹ (litmus test) ہے۔ سیدھی سی بات ہے‘ ہر شخص ذاتی محاسبہ کرے کہ پیسے میں زیادہ وزن ہے یا اللہ کے حکم میں؟ آج اچھے بھلے مسلمان لوگ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ اجی سود حرام ہوگا لیکن اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا —— تو کیا ہمارا معاشرہ اُسی رخ پر نہیں جا رہا جو خالص سیکولر نقطۂ نظر ہے۔

پاکستان کے بارے میں دوسری بات یہ کہ اس کی وجہ جواز بھی صرف اسلام تھی اور اس کی بقاء اور اس کے دوام و استحکام کی بنیاد بھی صرف اسلام ہے۔ مَیں نے اپنی تالیف ''استحکامِ پاکستان'' میں اس پر وضاحت سے لکھا ہے کہ ہندوستان کی یہ تقسیم باقی ہر اعتبار سے مصنوعی اور غیر فطری ہے اور اس کے لیے سوائے مذہب کی بنیاد کے اور کوئی بنیاد سرے سے موجود نہیں ہے۔ لسانی اعتبار سے یہ غیر فطری ہے' کیونکہ مشرقی پنجاب کا سکھ بھی پنجابی بولتا ہے اور مغربی پنجاب کا مسلمان بھی پنجابی بولتا ہے۔ نسلی اعتبار سے بھی اس کی کوئی بنیاد نہیں بنتی' کیونکہ وہی جاٹ سکھ ہے اور وہی جاٹ مسلمان ہے۔ ایک ہی راجپوت نسل ہے' مسلمان بھی راجپوت ہے اور ہندو بھی راجپوت ہے۔ وہی شیخ مسلمان ہو گئے تو شیخ کہلاتے ہیں اور ہندو ہیں تو بنیے کہلاتے ہیں۔ اسی طرح جغرافیائی اعتبار سے بھی یہ تقسیم غیر فطری اور غیر منطقی ہے۔ زمینی تقسیم اس طرح کی گئی کہ دریا بھی کاٹ دیے گئے۔ ہمارے اور بھارت کے درمیان کوئی فطری سرحد موجود نہیں۔ بھارت نے تو سینکڑوں میل تک تار لگا کر اس میں بجلی کا کرنٹ دوڑایا ہے' ورنہ بھارت اور پاکستان کے درمیان کوئی حقیقی رکاوٹ ہے ہی نہیں۔ تو لسانی' نسلی اور جغرافیائی' ہر اعتبار سے پاکستان کا قیام بلا جواز ہے' اور اس کے لیے سوائے اسلام کے اور کوئی وجہ جواز نہیں۔

یہ ملک دو قومی نظریے کی بنیاد پر قائم ہوا' یعنی ہمارا نظام' ہمارا قانون' ہماری تہذیب اور ہمارا تمدن ہندو سے بالکل مختلف ہے اور ہماری قومیت کی بنیاد ہمارا مذہب ہے۔ چنانچہ تحریک پاکستان کا نعرہ یہی تھا ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ !''—— اور اس سے بھی بڑھ کر' صد فی صد درست بات ہے کہ اس کی بقا اور استحکام بھی صرف اسلام کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ اگر مستحکم ہو سکتا ہے تو صرف اسلام کی بنیاد پر' ورنہ اس کو مستحکم کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ دنیا کی دوسری مسلمان قومیں بغیر اسلام کے بھی زندہ رہ سکتی ہیں' لیکن پاکستان بغیر اسلام کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ مثال کے طور پر ترکی ایک مسلمان ملک ہے جس میں اسّی فیصد لوگ ترک ہیں اور ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ تو لسانی اور نسلی وحدت انہیں جمع رکھ سکتی ہے' مگر ہمیں کیا چیز جمع کرے گی؟ ہمیں مجتمع رکھنے والی کوئی شے اسلام کے سوا ہے ہی نہیں۔ علّامہ اقبال کا یہ شعر ؎

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

پاکستان پر تو صد فی صد منطبق ہوتا ہے' جبکہ کسی دوسرے مسلمان ملک پر اس شعر کا بتمام وکمال انطباق نہیں ہوتا۔

تیسری بات یہ کہ اگر یہاں اسلام نہ آیا تو یہ ملک اپنا جواز کھو دے گا' لہٰذا یہ قائم نہیں رہے گا اور اس کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ جو چیز اپنا جواز کھو دے وہ ہو سکتا ہے کچھ دن دوسروں کے سہارے' دوسروں کی مصلحتوں کی وجہ سے باقی رہ جائے' لیکن آخر کار قائم نہیں رہ سکتی۔ صرف وقت کا معاملہ ہے کہ اس کے ٹوٹنے یا ختم ہونے میں کتنا وقت لگتا ہے۔ مشرقی پاکستان تو آج (۱۹۹۳ء) سے بائیس برس قبل بنگلہ دیش بن چکا۔ یہ باقی کا بچا کھچا پاکستان بھی اسلام کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا' بلکہ اس کے کئی ٹکڑے ہو جائیں گے۔ اگر بے نظیر صاحبہ اور ان کی پارٹی اس ملک کو سیکولر بنانا چاہتی ہیں تو یہ گویا اس ملک کی نفی ہے۔ وہ اگر یہ سمجھتی ہیں کہ سیکولرازم کی بنیاد پر یہ ملک مستحکم ہو جائے گا تو قطعاً ناممکن ہے ع ''ایں خیال است و محال است و جنوں!'' وہ دراصل پاکستان کے genesis سے واقف نہیں۔ انہوں نے چاندی بلکہ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر آنکھ کھولی ہے۔ وہ پاکستان میں اقتدار کے ایوانوں میں ضرور گھومی پھری ہیں لیکن انہیں کیا پتہ کہ یہ ملک کس طور سے بنا تھا' کن کی قربانیوں سے بنا تھا' کن نعروں سے بنا تھا۔ اسی طریقے سے اگر نواز شریف صاحب یا ان کے ساتھیوں کا یہ خیال ہو کہ ہم اس ملک کو کوریا بنا دیں گے' یا ہانگ کانگ یا سنگاپور بنا دیں گے اور اس سے یہ ملک مستحکم ہو جائے گا تو یہ بھی پرلے درجے کی احمقانہ بات ہے۔ یہ چیز بھی اس ملک کے استحکام کی بنیاد نہیں ہو سکتی۔ اس ملک کا جواز بھی اسلام سے ہے اور اس کے استحکام کی واحد بنیاد بھی اسلام ہے۔

چوتھی بات یہ کہ جب اس ملک کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کا ملک تو ہے' اسلامی ریاست ہرگز نہیں ہے تو اب یہاں سیاست کی کیا حیثیت ہے۔ اس میں حصّہ لیا جائے یا نہ لیا جائے؟ اس کا تجزیہ بھی مَیں نے اپنی کتاب ''استحکامِ پاکستان'' میں کیا ہے۔ دراصل سیاست کے دو حصے ہیں: (i) نظری سیاست' اور (ii) عملی سیاست۔ نظری سیاست یہ ہے کہ ملک اور قوم کے حالات و مسائل پر غور و فکر کیا جائے' اس کے بارے میں سوچ سمجھ کر صحیح رائے قائم کی جائے اور پھر اسے لوگوں کے سامنے بیان کیا جائے۔ نظری سیاست ملک کے ہر باشعور شہری کا فرض ہے اور ہر باشعور مسلمان کا تو فرضِ عین ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک

باشعور مسلمان اپنے آپ کو اس سے منقطع کر لے۔ یہ گویا سیاست کا پچاس فیصد ہے۔ اس نظری سیاست میں سب سے بڑا حصّہ صحافی حضرات لیتے ہیں جبکہ انہیں ''سیاست دان'' کوئی نہیں کہتا۔ وہ لوگوں کی سوچ کا رخ معیّن کرتے ہیں' اُن کی رائے بناتے ہیں لیکن وہ سیاست دان نہیں ہیں۔ یہود ساری دنیا پر' خاص طور سے امریکہ پر ذرائع ابلاغ ہی کی وجہ سے چھائے ہوئے ہیں۔ ٹیلی ویژن ہو یا پریس' تمام ذرائع ابلاغ ان کے قبضے میں ہیں' اور اسی وجہ سے وہ پوری امریکی قوم کی سیاست کا رخ معیّن کرتے ہیں' بقول اقبالؒ ''فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!'' مَیں خود نظری سیاست کا نہ صرف قائل ہوں بلکہ اس میں خود حصّہ لیتا رہا ہوں' ہماری تنظیم اسلامی بھی اس میں بھر پور حصّہ لیتی رہی ہے اور میرے نزدیک ہر مسلمان کو اس میں حصّہ لینا چاہیے۔

البتہ سیاست کا دوسرا حصّہ عملی سیاست ہے۔ اس عملی سیاست کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر لیجیے۔ عملی سیاست کا ایک پہلو ہے ملک میں جو نظام قائم ہے اسے چلانے کے لیے سیاست' جبکہ اس کا دوسرا پہلو ہے موجودہ نظام کو غلط سمجھتے ہوئے اسے بدلنے کے لیے سیاست۔ اوّل الذکر انتخابی سیاست ہے اور مؤخر الذکر انقلابی سیاست۔ ملک میں جو نظام قائم ہے اسے اگر آپ درست سمجھتے ہیں تو اسے چلانے کے لیے الیکشن میں حصّہ لیجیے' اپنا منشور دیجیے' اپنی پالیسی دیجیے' الیکشن میں اپنے امیدوار کھڑے کیجیے' پھر الیکشن میں جن کو بھی عوام ووٹ دے دیں گے وہ نظامِ حکومت چلائیں گے۔ اگر آپ کو عوام نے منتخب نہیں کیا تو اپوزیشن میں بیٹھ کر اپنا رول ادا کرتے رہیے اور منتظر رہیے' ہوسکتا ہے اس سے اگلے الیکشن میں لوگ آپ کو ووٹ دے دیں۔ لیکن یہ جو سیاسی عمل ہے' جسے انتخابی عمل کا نام دیا جاتا ہے' یہ نظام کو بدلنے کے لیے نہیں ہوتا' بلکہ پہلے سے قائم نظام کو چلانے کے لیے ہوتا ہے۔ امریکہ کے انتخابات میں حصّہ لینے والے ڈیموکریٹس ہوں یا ری پبلکن ہوں وہ نظام نہیں بدلنا چاہتے' وہ اسی نظام کو چلانا چاہتے ہیں۔ گویا امریکہ میں قائم پارلیمانی جمہوری نظام ان کے مابین متفق علیہ ہے۔ اسی طرح برطانیہ کی کنزرویٹو پارٹی یا لیبر پارٹی' ان میں سے برطانیہ کے نظام کو کوئی بھی نہیں بدلنا چاہتا' البتہ اس کو بہتر سے بہتر انداز میں چلانے کے لیے یہ اپنی طرف سے بہتر سے بہتر پالیساں پیش کرتے رہتے ہیں۔ تو یہ ہے کسی نظام کو چلانے کی سیاست جو عہدِ حاضر میں ''انتخابی سیاست'' کہلاتی ہے۔ اس میں اور ''انقلابی سیاست'' میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

انقلابی سیاست پہلے سے موجود نظام کو بدلنے کی سیاست ہے۔ جو شخص موجودہ نظام ہی کو غلط سمجھتا ہے اسے الیکشن میں حصّہ لے کر کیا کرنا ہے۔ یہ اُس کے وقت کا ضیاع ہے۔ فرض کریں اگر امریکہ میں کمیونسٹ ہوں تو وہ الیکشن میں حصّہ لیں گے؟ نہیں! بلکہ وہ تو کچھ اور ہی کام کریں گے' اگر ان کا داؤ چل جائے تو وہ انقلاب کی جدّوجُہد کریں گے۔ انتخابات میں آکر اپنی منزل کھوٹی نہیں کریں گے۔ دنیا میں جیسے انقلاب آتے ہیں وہ سب کو معلوم ہے۔ جیسے روس کا انقلاب آیا تھا' جیسے فرانس کا انقلاب آیا تھا اور جیسے ایران میں انقلاب آیا تھا وہ کس کو معلوم نہیں؟ خمینی صاحب وہاں قیامت تک انتخابات کے ذریعے برسرِاقتدار نہیں آسکتے تھے۔ اور وہاں جو بھی تبدیلی جس درجے میں بھی آئی ہے' وہ نہ انتخابات کے ذریعے آسکتی تھی اور نہ ہی وعظ و نصیحت اور تلقین و تبلیغ کے ذریعے آسکتی تھی۔ وہاں جو تبدیلی آئی ہے اس سے ہمارا اتفاق ضروری نہیں ہے۔ ہمیں کمیونزم سے اتفاق نہیں ہے' لیکن اس کی بھی مثال تو دے رہے ہیں کہ اس کے عنوان سے ایک انقلاب تو دنیا میں آیا تھا۔

ہم نے اپنے لیے جو راستہ منتخب کیا ہے وہ اسی انقلابی سیاست کا ہے' انتخابی سیاست کا نہیں ہے۔ اس طرح مَیں اور میرے ساتھی ۷۵ فیصد سیاست میں ہیں' لیکن ۲۵ فیصد سیاست میں نہیں ہیں اور وہ ہے انتخابی سیاست۔ ہمارے نزدیک یہاں جو جائز سیاست ہے وہ انقلابی سیاست ہے۔ یعنی یہاں کے نظام کو بدلنے کی جدّوجُہد کی جائے' اس کے لیے جماعت بنائی جائے' طاقت فراہم کی جائے' باطل نظام کے ساتھ ٹکرایا جائے اور اس کو بیخ و بُن سے اُکھیڑ کر رکھ دیا جائے اور اس کی جگہ اسلام کا نظام قائم کیا جائے۔ اس کو چھوڑ کر انتخابی سیاست میں حصّہ لینا ہمارے نزدیک وقت کا ضیاع ہے۔ یہ ملک کے لیے بھی صحیح نہیں' اور جیسا کہ مَیں کہہ چکا ہوں' دینی اعتبار سے بھی صحیح نہیں ہے۔

انقلابی سیاست کا مفہوم

اس سلسلے کی اگلی بحث یہ ہے کہ وہ انقلابی سیاست ہے کیا؟ اسے اختصار کے ساتھ واضح کر دیتا ہوں۔ یہ وہ موضوع ہے جس پر مَیں نے پوری پوری مفصّل تقریریں کی ہیں۔ اس ضمن میں ''منہج انقلابِ نبوی ﷺ'' کے عنوان سے کتاب بھی موجود ہے جو میرے گیارہ خطباتِ جمعہ پر مشتمل ہے۔ پھر اس کو مزید مختصر کر کے اس سال قرآن آڈیٹوریم میں پانچ خطابات میں بیان کیا

ہے‘ جس کے ویڈیو کیسٹ بھی تیار ہو گئے ہیں۔ یہاں مَیں اسی بات کو چند جملوں میں بیان کر رہا ہوں۔ یہ بات اچھی طرح جان لیجیے کہ اس ملک میں اسلام کبھی بھی انتخابی سیاست کے راستے سے نہیں آ سکتا‘ بلکہ جب بھی آئے گا انقلابی عمل کے ذریعے ہی سے آئے گا۔ انقلابی سیاست یا انقلاب کا عمل یہ ہے کہ سب سے پہلے لوگوں میں ذہنی اور فکری تبدیلی برپا کی جائے۔ جس طرح ہر عمارت کسی بنیاد پر قائم ہوتی ہے اسی طرح ہر نظام کسی فکر اور کسی نظریہ کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر پہلے سے موجود نظام کو بدلنا ہے تو متبادل فکر اور نظریہ (alternate idealogy) پیش کرنا ہوگا اور اسے لوگوں کے ذہنوں میں اتارنا ہوگا۔ یہ متبادل فکر جب ذہنوں میں راسخ ہو جائے گا تو لوگوں کے اعمال اور اخلاق میں بھی انقلاب آ جائے گا۔ سوچ بدلے گی تو عمل بھی لازمی طور پر بدلے گا۔ کسی بھی انقلاب کے لیے یہ دو بنیادی تبدیلیاں ناگزیر ہیں‘ یعنی سوچ اور فکر کی تبدیلی‘ اور عمل اور اخلاق کی تبدیلی۔

البتہ یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ یہ تبدیلی اکثریت میں نہیں آیا کرتی‘ ہمیشہ ایک اقلیت میں آتی ہے۔ لیکن وہ اقلیت منظم ہو کر اپنی تنظیم کے بل پر نہایت مؤثر ہو جاتی ہے‘ جیسے آپ کہتے ہیں: ایک اکیلا دو گیارہ اور تیسرا لگ گیا تو ایک سو گیارہ‘ چوتھا لگ گیا تو ایک ہزار ایک سو گیارہ۔ اس اعتبار سے وہ اقلیت منظم ہونے کے بل پر غالب آتی ہے اور نظام کو بدل دیتی ہے۔ ورنہ ایسے لوگ کبھی بھی دنیا میں اکثریت میں نہیں ہوئے۔ خود رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی پورے جزیرہ نمائے عرب کی تعداد کے اعتبار سے دیکھیں تو اکثریت مومنین صادقین کی نہیں تھی۔ یہاں کسی کو کوئی مغالطہ نہ ہو‘ مَیں پورے جزیرہ نمائے عرب کی بات کر رہا ہوں کہ وہاں اکثریت مومنین صادقین کی نہیں تھی‘ صرف مکہ اور مدینہ کی بات نہیں کر رہا۔ اگر پورے ملک عرب میں اکثریت مومنین صادقین کی ہوتی تو کیا مسیلمہ کذّاب کا ساتھ دینے کے لیے لاکھوں آدمی نکل آتے؟ کیا زکوٰۃ کا انکار کرنے والے لاکھوں آدمی میدان میں آ جاتے؟

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مؤمن صادق ہو اور پیچھے ہٹ جائے۔ ع ”این خیال است و محال است و جنوں!“ جو مؤمن صادق ہے اس کے تو چاہے بخیے ادھیڑ دیے جائیں‘ اس کے جسم کی دھجیاں اُڑا دی جائیں تب بھی وہ پیچھے نہیں ہٹتا۔ معلوم ہوا کہ وہاں پر بھی عرب کی اکثر آبادی کے اعتبار سے اصل حکم وہی تھا جو سورۃ الحجرات میں بایں الفاظ وارد ہوا ہے:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۭ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ﴾ (الحجرات:۱۴)

”یہ بدو دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو‘ بلکہ یوں کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں‘ اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔“

تو یہ ایک مثال ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ فکر و عمل کی تبدیلی کبھی اکثریت میں نہیں آیا کرتی۔ کیا انقلابِ روس کے وقت روس کے اندر اکثریت کمیونسٹوں کی ہو گئی تھی؟ یہ تو کبھی بھی نہیں ہوئی‘ آخری وقت تک نہیں ہوئی۔ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر تو ہمیشہ چند لاکھ ہی رہتے تھے جبکہ ملک کی آبادی کروڑوں پر مشتمل تھی۔ تو انقلابی عمل میں کبھی اکثریت تبدیل نہیں ہوا کرتی‘ ہمیشہ اقلیت منظم ہوتی ہے‘ لیکن یہ اقلیت ہوتے ہوئے اپنی تنظیم اور اپنی قربانی کے بل پر اکثریت پر غالب آ جاتی ہے۔ اگر کہیں دس آدمی ہوں لیکن وہ سب کے سب اپنی جان بچانے کی فکر میں ہوں‘ اور دوسری طرف صرف دو آدمی اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر آ جائیں تو وہ دس فوراً بھاگ کھڑے ہوں گے۔ وہ ان دو کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہیں ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نااُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے

جسے موت زندگی سے زیادہ خوش آئند ہو جائے اُسے خوف کاہے کا؟ اب اُسے کیا شے ڈرائے گی؟ ان دو تبدیلیوں کے بعد یہ اقلیت جب معتدبہ تعداد میں منظم ہو جاتی ہے تو پھر ٹکراؤ مول لیتی ہے اور اس کا اس نظام کے ساتھ تصادم ہوتا ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ آج کے زمانے میں اس تصادم اور ٹکراؤ کی صورت کیا ہوگی۔ حضور ﷺ کے زمانے میں تو یہ تلوار کے ساتھ تلوار کا ٹکراؤ تھا‘ لیکن آج کے زمانے میں معاملہ اس اعتبار سے مختلف ہے کہ مدّمقابل بھی مسلمان ہیں‘ خواہ نام کے مسلمان ہی ہوں۔ سیکولر ذہن والے بھی اور ملحدانہ نظریات رکھنے والے بھی مسلمان ہیں‘ بھٹو صاحب بھی مسلمان تھے‘ بے نظیر بھی مسلمان ہے اور نواز شریف بھی مسلمان ہے جس نے نفاذِ شریعت ایکٹ کے اندر سود کو جاری رکھنے کا اعلان کر دیا۔ نواز شریف تو خیر سے نمازی بھی ہے اور ان کا گھرانہ بھی مذہبی گھرانہ

ہے۔ دوسرے یہ کہ آج کل کی حکومتوں کے پاس قوت بہت زیادہ ہوتی ہے اور عوام نہتے ہوتے ہیں‘ لہٰذا حکومت کے خلاف کوئی مسلح جدّوجُہد کامیاب نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ موجودہ حالات میں اس کے لیے جو طریق کار اختیار کیا جانا چاہیے اس کی مثال ایرانیوں نے ہمارے سامنے پیش کر دی ہے۔ یعنی نہتے عوام سڑکوں پر آ کر حکومتی نظام کو معطل کر دیں‘ منکرات کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں کہ ہم اپنے جیتے جی یہ نہیں ہونے دیں گے۔ ان پر تشدد کیا جائے تو برداشت کریں‘ گولیاں چلیں تو اپنے سینوں پر گولیاں کھائیں اور راہِ حق میں جان دے دیں۔ یقیناً اس سے بڑھ کر نفع کا سودا اور کوئی نہیں ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت ‘ نہ کشور کشائی!

آپ دیکھتے ہیں کہ ایرانیوں نے اس طریقے سے بادشاہ کو راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر کے دکھا دیا۔ انہوں نے نہ تو بغاوت کی‘ نہ کوئی توڑ پھوڑ کی اور نہ کوئی چھاپہ مار کارروائیوں کا سلسلہ شروع کیا‘ لیکن ایران کی اڑھائی ہزار سالہ عظمت رفتہ کی بازیافت کے خواب دیکھنے والے ’’شہنشاہ آریہ مہر‘‘ کو ایران سے فرار ہونے پر اس طرح مجبور کر دیا کہ ع ’’دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں!‘‘ یہ بڑی عظیم مثال ہے جو آج کے دور میں ہمارے سامنے آئی ہے اور اسی طریق کار سے اس ملک میں اسلام کا نظام قائم کیا جا سکتا ہے۔

مَیں پھر کہہ رہا ہوں کہ اسلام یہاں نہ تو الیکشن کے راستے سے آ سکتا ہے اور نہ صرف وعظ و نصیحت کے ذریعے سے۔ اگر صرف وعظ و نصیحت سے اسلام آ جاتا تو رسول اللہﷺ کسی مسلمان کی جان تو کجا کسی کافر کی جان کا ضیاع بھی گوارا نہ کرتے۔ آپؐ سے بڑا معلّم‘ آپؐ سے بڑا مبلّغ‘ آپؐ سے بڑا واعظ‘ آپؐ سے بڑا مربّی اور آپؐ سے بڑا مزکّی بھلا کوئی ہو سکتا ہے؟ اگر کوئی سمجھتا ہے کہ محض دعوت و نصیحت اور تبلیغ و تلقین ہی سے نظام بدل جائے گا تو وہ جنت الحمقاء میں بستا ہے‘ اور میرے نزدیک وہ شخص محمد رسول اللہﷺ کی ذات پر طعن کر رہا ہے کہ انہوں نے اس راستے میں اپنا اور اپنے ساتھیوں کے خون کا نذرانہ کیوں دلوایا؟ دامنِ اُحد میں خود آنحضورﷺ کا خون زمین میں جذب ہوا ہے اور سینکڑوں صحابہ کرام ؓ کی جانیں اس راہ میں قربان ہوئی ہیں۔ آپﷺ کے ایک صحابیؓ کی جان آج کے لاکھوں مسلمانوں کی

جانوں سے زیادہ قیمتی ہے یا نہیں؟

اسی طرح بعض تحریکوں نے یہ جو تیسرا راستہ اختیار کر لیا پُرتشدد چھاپہ مار کارروائیوں کا‘ تو اس راستے سے بھی اسلام نہیں آ سکتا۔ ایسی کارروائیاں باہر سے آئی ہوئی قابض افواج کے خلاف تو کامیاب ہو سکتی ہیں جن کی سپلائی لائن بہت طویل ہو‘ لیکن قومی فوج کے خلاف کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ اس وقت الجزائر اور مصر میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ میرے نزدیک صحیح طریقہ نہیں ہے۔ اگرچہ مجھے ان لوگوں کے ساتھ بڑی ہمدردی ہے اور مصر کی ’’جماعہ اسلامیہ‘‘ کے لوگوں کو تو مَیں بہت قیمتی سمجھتا ہوں‘ لیکن انہوں نے جو طریقہ اختیار کر لیا ہے وہ غلط ہے‘ چاہے وہ حکومتی تشدد کے ردِّعمل میں اختیار کیا ہو۔ ان تینوں راستوں کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ یہ اسلام لانے کے راستے نہیں ہیں۔ اسلام لانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے انقلابی راستہ۔ اس انقلابی عمل کے لیے دینی اصطلاحات مَیں بعد میں بتاؤں گا‘ ابھی تو عمومی انداز میں یہ بتایا ہے کہ انقلاب کسے کہا جاتا ہے۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ (i) ایک انقلابی نظریے کے تحت‘ ایک معتد بہ تعداد میں فکری اور نظری تبدیلی اور اس کے نتیجے میں عملی اور اخلاقی تبدیلی برپا کرنا۔ (ii) پھر ان لوگوں کو ایک جماعت کی صورت میں منظم کرنا۔ (iii) پھر نظامِ باطل کے ساتھ ٹکراؤ مول لینا۔ بقولِ اقبال ؎

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!

دینی اصطلاح میں پہلی بات یہ ہوگی کہ سب سے پہلے کچھ لوگوں میں شعوری ایمان پیدا کیا جائے۔ ایمان ایک فکر بھی ہے‘ فلسفہ بھی ہے‘ ایک رائے بھی ہے‘ ایک Metaphysics (مابعد الطبیعیات) بھی ہے‘ نفسیات بھی ہے‘ لیکن انقلاب کے لیے مطلوب یہ ہے کہ ایک معتد بہ تعداد میں بھی شعوری ایمان پیدا ہو جائے‘ اور اس کے نتیجے میں عملی تبدیلی یعنی تقویٰ پیدا ہو جائے۔

یہ مضمون سورۂ آلِ عمران کی آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴ میں وارد ہوا ہے اور ان تین آیات کے حوالے سے میری ایک کتاب بھی ’’اُمّتِ مُسلمہ کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل‘‘ کے عنوان سے موجود ہے۔ ان تین آیات میں تین نکات بیان ہوئے ہیں۔ پہلا نکتہ یہ کہ:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾﴾

''اے ایمان (کا دعویٰ کرنے) والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اُس کے تقویٰ کا حق ہے' اور (دیکھنا!) تمہیں ہرگز موت نہ آنے پائے مگر فرمانبرداری کی حالت میں۔''

یعنی جب اللہ پر ایمان لائے ہو تو اُس کے تقویٰ کا حق بھی ادا کرو اور تمہارا کوئی لمحہ بھی اُس کی معصیت میں بسر نہیں ہونا چاہیے۔ اب جو لوگ یہ مرحلہ طے کر لیں اور اللہ کے سامنے اپنے اختیار کو اُس کے قدموں میں ڈال دیں وہ مل جل کر ایک طاقت بنیں۔ چنانچہ اگلی آیت میں دوسرا نکتہ بیان فرمایا: ﴿وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا ﴾ ''اور سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو اور باہم متفرق نہ ہو''۔ اللہ کی رسّی کے ساتھ چمٹ جاؤ' قرآن کو اپنا امام اور راہنما بناؤ اور مل جل کر ایک قوت بنو' طاقت بنو' حزب اللہ بنو' پھر منتشر نہ ہو۔ یہ ایک جماعت بنانا ہے' جس کے لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ: بِالْجَمَاعَۃِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ وَالْھِجْرَۃِ وَالْجِھَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ))

''(مسلمانو!) مَیں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دے رہا ہوں: جماعت (کی شکل اختیار کرنے) کا' (پھر اس جماعت میں جو حکم ملے اسے) سننے اور ماننے کا' اور ہجرت کا اور جہاد کا۔''

ان پانچ چیزوں سے انقلاب برپا ہوگا۔ یہی مضمون سورۃ التغابن میں بایں الفاظ آیا ہے:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسۡتَطَعۡتُمۡ وَاسۡمَعُوۡا وَاَطِیۡعُوۡا وَاَنۡفِقُوۡا خَیۡرًا لِّاَنۡفُسِکُمۡ ؕ وَمَنۡ یُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۶﴾﴾

''پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اپنی حد امکان تک' اور سنو اور اطاعت کرو' اور خرچ کرو اپنے بھلے کو۔ اور جو کوئی بچا لیا گیا اپنے جی کے لالچ سے تو یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

تو پہلے شعوری ایمان پیدا ہو' پھر اپنی زندگی میں اور اپنے دائرۂ اختیار میں' یعنی اپنے گھر میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ گویا اپنی ذات میں اللہ کے خلیفہ بن جاؤ' اپنے وجود پر اللہ کی حاکمیت نافذ کرو۔ اپنے گھر میں اللہ کے خلیفہ بن جاؤ' اللہ کے احکام اپنے گھر میں نافذ کرو۔ پھر مل جل کر ایک جماعت بنو' طاقت بنو' حزب اللہ بنو۔ پھر اس کے بعد تیسرا نکتہ یہ کہ:

﴿وَلۡتَکُنۡ مِّنۡکُمۡ اُمَّۃٌ یَّدۡعُوۡنَ اِلَی الۡخَیۡرِ وَیَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَیَنۡہَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۰۴﴾﴾

''اور چاہیے کہ تم سے ایک ایسی جماعت وجود میں آئے جو خیر کی دعوت دے' نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے۔ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

یعنی تمہاری جو اجتماعیت وجود میں آئے گی اسے تین کام کرنے ہوں گے: (i) دعوت الی الخیر (ii) امر بالمعروف' اور (iii) نہی عن المنکر۔ سب سے پہلا کام خیر کی دعوت دو' خیر کی طرف بلاؤ! اور سب سے بڑا خیر اللہ کا کلام ہے جس کے بارے میں سورۂ یونس میں فرمایا گیا: ﴿ہُوَ خَیۡرٌ مِّمَّا یَجۡمَعُوۡنَ ﴿۵۸﴾﴾ کہ جو دولت تم جمع کرتے ہو' جو روپیہ اور مال و اسباب جمع کرنے کی تم تگ و دو کر رہے ہو' ان سب سے بڑھ کر خیر' خیر مطلق یہ قرآن ہے۔ تو دعوت الی الخیر کا مطلب دعوت الی القرآن ہے۔ دوسرا کام ہے امر بالمعروف' نیکی کا حکم دو! اور تیسرا نہی عن المنکر' بدی سے روکو!

پھر ان میں سے تیسری چیز ''نہی عن المنکر'' کے تین درجے رسول اللہ ﷺ نے بیان فرما دیے۔ مسلم شریف کی بہت مشہور حدیث ہے جو حضرت ابوسعید خدری ؓ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے خود رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ' فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ' فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ' وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ))

''جو کوئی بھی تم میں سے کسی منکر کو دیکھے تو وہ اپنے ہاتھ سے اسے بدلے! اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے (اس برائی کو روکے!) اور اگر اس کی استطاعت بھی نہ ہو تو اپنے دل سے (اس کے خلاف نفرت رکھے)' اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔''

یعنی نہی عن المنکر کا پہلا درجہ ''بالید'' کا ہے —— کہ کوئی برائی نظر آئے تو اپنے زورِ بازو سے اس کو روک دیا جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب اس برائی سے نمٹنے کے لیے مؤثر قوت موجود ہو۔ بصورتِ دیگر بندۂ مؤمن کا فرض ہے کہ وہ اس قوت کے حصول کے لیے کوشاں ہو اور اس کے ساتھ ہی ''نہی عن المنکر باللسان'' کا فریضہ ادا کرتا رہے۔ یعنی زبان سے لوگوں کو روکا جائے کہ خدا کے لیے اس سے باز آ جاؤ' اس بُرائی کو چھوڑ دو۔ زبان کے علاوہ قلم اور نشر و اشاعت کے دیگر ذرائع بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ اور اگر اس کی بھی استطاعت

نہیں ہے تو کم از کم دل سے تو اسے برا سمجھے‘ برائی کے خلاف دل میں نفرت تو موجود ہو۔ آخر میں فرمایا کہ یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے‘ یعنی اگر یہ بھی نہیں تو ایمان ہی نہیں۔

اسی مضمون کی ایک دوسری حدیث کا ہم ابھی مطالعہ کریں گے‘ اس کے آخر میں الفاظ آئے ہیں: ((وَلَیْسَ وَرَاءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ)) کہ اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں! خواہ اپنے آپ کو مؤمن اور متقی سمجھتے رہو‘ لیکن اگر منکر سے نفرت ہی ختم ہوگئی ہے تو ایمان کی یکسر نفی ہوگئی ہے۔ اگر راتوں کی نیند بھی حرام نہیں ہوتی کہ یہ ماحول میں کیا ہو رہا ہے اور مَیں اس کے خلاف کچھ کر نہیں پا رہا‘ اگر منکرات کو دیکھ کر چہرے کا رنگ بھی متغیر نہ ہو اور انسان اندر سے تلملا نہ اُٹھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی غیرتِ ایمانی دم توڑ گئی ہے۔ اور حضور ﷺ فرما رہے ہیں کہ اس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان باقی نہیں رہا۔ اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْ ذٰلِکَ!

دوسری حدیث اس سے بھی زیادہ واضح ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ سے مروی ہے۔ یہ بھی صحیح مسلم کی روایت ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کبارِ صحابہؓ اور فقہاءِ صحابہؓ میں سے ہیں۔ فقہ حنفی دراصل فقہ عبداللہ بن مسعودؓ ہے اور حضرت امام ابوحنیفہؒ دو واسطوں سے حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کے شاگرد ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((مَا مِنْ نَبِیٍّ بَعَثَہُ اللّٰہُ فِیْ اُمَّةٍ قَبْلِیْ)) ”کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جسے اللہ نے مجھ سے پہلے کسی اُمّت میں مبعوث فرمایا ہو۔“ ((اِلَّا کَانَ لَہٗ مِنْ اُمَّتِہٖ حَوَارِیُّوْنَ وَاَصْحَابٌ)) ”مگر یہ کہ اس کے لیے اس کی اُمّت میں سے کچھ حواری اور اصحاب ضرور ہوتے تھے“۔ گویا ہر نبیؑ کے کچھ نہ کچھ حواری اور اصحاب ضرور ہوتے تھے‘ کم ہوں یا زیادہ۔ بارہ ہوں‘ ۷۲ ہوں‘ سینکڑوں ہوں یا ہزاروں۔ ”حواری“ حضرت عیسیٰ ؑ کے ساتھیوں کو کہا جاتا ہے اور ”صحابہ“ اور ”اصحابؓ“ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کو۔ اب آگے فرمایا جا رہا ہے کہ یہ حواری اور اصحاب کرتے کیا تھے: ((یَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِہٖ وَیَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِہٖ)) ”وہ اُس (نبیؑ) کی سُنّت کو مضبوطی سے پکڑتے تھے اور اُس کے حکم کے مطابق چلتے تھے۔“

((ثُمَّ اِنَّھَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِھِمْ خُلُوْفٌ)) ”پھر (ہمیشہ ایسا ہوتا رہا کہ) ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آجاتے“ —— جیسے ہم ناخلف ہیں۔ آج کے مسلمان پوری دنیا میں اسلام کو

بدنام کرنے والے اور اس کی حرمت کو بٹہ لگانے والے ہیں‘ خواہ تعداد میں وہ ۱۳۰ کروڑ ہوں۔ یہ ناخلف لوگ کیا کرتے تھے؟ فرمایا: ((یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ وَیَفْعَلُوْنَ مَا لَا یُؤْمَرُوْنَ)) ”کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے‘ اور کرتے وہ تھے جس کا انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا“۔ یعنی قول و فعل کے زبردست تضاد کا شکار ہو جاتے تھے‘ جیسے اس وقت ہمارا حال ہے کہ دعوے بہت بلند بانگ لیکن عمل کے اعتبار سے صفر ہیں۔ عشقِ رسول ﷺ کے دعووں میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جا رہے ہیں لیکن خود اپنے وجود اور اپنی شکل و صورت میں بھی سُنّتِ رسولؐ کا التزام نہیں ہے۔ سیرت النبی ﷺ کے عنوان سے جلوس نکالا جا رہا ہے اور اس میں بھنگڑا ڈالا جا رہا ہے۔ ہم وہ کچھ کر رہے ہیں جس سے ہمیں رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا تھا۔ پھر ((یَفْعَلُوْنَ مَا لَا یُؤْمَرُوْنَ)) سے وہ بدعات اور نئی نئی رسومات بھی مراد ہیں جو بعد کے ادوار میں ایجاد کر لی جاتی ہیں‘ جن کا نہ اللہ کی کتاب میں کوئی حکم ہے‘ نہ اُس کے رسول ﷺ کی سُنّت اور صحابہ کرامؓ کے طرزِ عمل میں ان کا کوئی ثبوت ملتا ہے۔

جب یہ صورت پیدا ہو جائے تو اب مؤمنین صادقین کو کیا کرنا ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَمَنْ جَاھَدَھُمْ بِیَدِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ)) ”تو جو کوئی ان سے جہاد کرے گا اپنے ہاتھ سے تو وہ مؤمن ہے۔“ ((وَمَنْ جَاھَدَھُمْ بِلِسَانِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ)) ”اور جو کوئی ان سے اپنی زبان سے جہاد کرے گا تو وہ بھی مؤمن ہے۔“ ((وَمَنْ جَاھَدَھُمْ بِقَلْبِہٖ فَھُوَ مُؤْمِنٌ)) ”اور جو کوئی بھی ان (ناخلف لوگوں) سے اپنے دل سے جہاد کرے گا تو وہ بھی مؤمن ہے“۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَلَیْسَ وَرَاءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ)) ”اور اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں ہے۔“

تو یہ ہے قرآن حکیم اور احادیثِ نبویؐ کے حوالے سے اس انقلابی عمل کی تعبیر‘ کہ جب تک وہ جماعت اتنی تعداد میں نہیں ہے کہ وہ چیلنج کر سکے اور میدان میں آ کر مقابلہ کر سکے اُس وقت تک وہ نہی عن المنکر باللسان کرتی رہے گی کہ خدا کے لیے باز آ جاؤ‘ ان حرام کاموں کو چھوڑ دو‘ بے حیائی کو ختم کرو‘ اخبارات کے صفحات کو عورتوں کی رنگین تصاویر سے مزین نہ کرو! سودی لین دین حرام ہے‘ یہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے خلاف اعلانِ جنگ ہے‘ اس سے باز آ جاؤ! اس کے لیے ہاتھ جوڑیں گے‘ خوشامدیں کریں گے۔ پھر مظاہرے کریں گے‘ پلے کارڈ لے کر

سڑکوں پر نکلیں گے‘ ذرائع ابلاغ میں سے جو بھی ہم استعمال کر سکیں گے‘ کریں گے‘ جو کچھ کہہ سکتے ہیں کہیں گے‘ جو کچھ چھاپ سکتے ہیں چھاپیں گے‘ آڈیو اور ویڈیو کا استعمال کریں گے۔ یہ سب کچھ نہی عن المنکر باللسان کے درجے میں ہے ـــــ اور جب کافی طاقت فراہم ہو جائے گی تو پھر میدان میں آئیں گے کہ ہم یہ سب کچھ نہیں ہونے دیں گے۔ پھر ہم منکرات کے خلاف سینہ تان کر کھڑے ہوں گے‘ باطل نظام کو چیلنج کریں گے اور اسے چلنے نہیں دیں گے۔ سسٹم کو بلاک کریں گے‘ یہاں تک کہ ترکِ موالات کریں گے‘ ٹیکس نہیں دیں گے کیونکہ یہ نظام درست نہیں ہے۔

ظاہر بات ہے کہ اس کے بعد پھر بھٹی دہک اُٹھے گی۔ جب آپ کہیں گے کہ ہم اس باطل نظام کو چلنے نہیں دیں گے تو اس نظام کے ساتھ جن کے مفادات وابستہ ہیں‘ جنہیں اس میں مراعات حاصل ہیں‘ جن کی چودھراہٹیں‘ سیادتیں اور قیادتیں اس کے ساتھ وابستہ ہیں وہ اس کا دفاع کریں گے کہ ع ”نظامِ کہنہ کے پاسبانو یہ معرضِ انقلاب میں ہے!“ پھر ٹکراؤ ہو گا ـــــ یہ ٹکراؤ جیسا کہ مَیں نے عرض کیا‘ حضور ﷺ کے زمانے میں تو تلوار کا تلوار سے اور انسانوں کا انسانوں سے ہوا‘ لیکن موجودہ دور میں اس ٹکراؤ کی جو صورت ہو گی وہ ”یک طرفہ جنگ“ کی ہو گی۔ یعنی جب آپ سڑک پر نکل کر سسٹم کو بلاک کریں گے تو آپ کو تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا‘ آپ کو یہ تشدد برداشت کرنا ہو گا‘ لیکن مقابلے میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں ہو گی۔ اگر گولیاں چلتی ہیں تو انہیں سینے پر سہنا ہو گا اور اس راستے میں جان کا نذرانہ دینا ہو گا۔ اسلامی انقلاب کا طریق کار یہی ہے‘ اس کے سوا کسی دوسرے راستے سے اسلام نہیں آ سکتا۔ تو یہ ہے پاکستان کے حالات کے اعتبار سے ہمارا موقف۔

درمیانی عرصے میں کرنے کا کام

اب آیئے چوتھی بات کی طرف۔ جب تک اس ملک میں اسلامی نظام قائم نہیں ہوتا اور یہ بالفعل ایک اسلامی ریاست کی حیثیت اختیار نہیں کرتا اس درمیانی عرصے میں کرنے کا کام کیا ہے؟ دعوت کا یہ کام تو ہم اپنی بساط بھر کر رہے ہیں‘ یعنی دعوتِ دین‘ توبہ اور تجدیدِ ایمان کی دعوت‘ اصلاحِ اعمال کی دعوت‘ تنظیم میں شمولیت کی دعوت‘ اسلام کے نظام عدلِ اجتماعی کو لوگوں میں متعارف کروانے کے لیے تحریک خلافت کی معاونت کی دعوت ـــــ لیکن اس عرصے کے

دوران کیا ملکی سیاست کے بارے میں ہم صرفِ نظر کر لیں یا اس حوالے سے بھی ہماری کوئی ذمہ داری بنتی ہے یا نہیں؟ اس ضمن میں ہماری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ یہ چونکہ بہرصورت ایک مسلمان معاشرہ ہے‘ گو اسلامی ریاست نہیں مگر مسلمان ملک تو ہے‘ یہاں کے بسنے والے ۹۵ فیصد سے زائد نام کے مسلمان تو ہیں‘ محمد رسول اللہ ﷺ کے نام لیوا تو ہیں‘ کلمہ گو تو ہیں‘ لہٰذا اس کی وقتی سیاست کے حوالے سے بھی ہم پر ایک دینی فریضہ عائد ہوتا ہے۔

مَیں یہ بات آج خاص طور سے بہت وضاحت سے کہہ رہا ہوں‘ کیونکہ بہت سے حضرات مجھے بہت ہی خیر خواہی سے مشورہ دیا کرتے ہیں کہ آپ خواہ مخواہ سیاسی تبصرے کرتے ہیں‘ تجزیے کرتے ہیں اور اس ضمن میں مشورے دیتے رہتے ہیں‘ جبکہ اس کا فائدہ تو کچھ ہوتا نہیں۔ نہ بے نظیر آپ کی سنتی ہے‘ نہ نواز شریف‘ اور نہ ہی صدر اسحاق سنتے ہیں۔ اور تو اور ضیاء الحق صاحب نے نہیں سنی‘ تو اس سے فائدہ کیا؟ آپ کیوں خوامخواہ وقت ضائع کرتے ہیں؟ دوسرے یہ کہ جو بات آپ کرتے ہیں وہ کسی کے حق میں چلی جاتی ہے اور کسی کے خلاف۔ تو آپ کی بات جس کے خلاف چلی گئی وہ آپ سے ناراض ہو جاتا ہے اور جس کے حق میں چلی گئی اس کا جو مخالف ہے وہ آپ سے ناراض ہوتا ہے‘ تو اس سے فائدہ کیا؟ اس سے تو بہتر ہے کہ آپ خاموش رہیں۔ یہ بات بظاہر بڑی وزنی نظر آتی ہے اور اس کو خلوص کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ ہمارے چاہنے والے‘ ہمارے کام سے دلچسپی رکھنے والے‘ ہمارے خیر خواہ یہ مشورہ دیتے رہے ہیں۔ آج مَیں اس کا جواب دے رہا ہوں‘ وہ یہ کہ مَیں یہ کام اپنا دینی فریضہ سمجھ کر کرتا ہوں۔ گویا مَیں اگر ملکی معاملات پر اظہارِ رائے کرتا ہوں تو اپنا دینی فریضہ سمجھ کر۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ دینی فریضہ تو کتاب وسنّت کی بنیاد پر ہو سکتا ہے‘ لہٰذا مَیں اس کی دلیل کے طور پر یہ حدیث پیش کر رہا ہوں۔

حضرت تمیم داری ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ)) یعنی دین تو نام ہی نصیحت کا ہے۔ نصیحت کا ترجمہ خیر خواہی بھی ہے‘ خلوص بھی ہے‘ وفاداری بھی ہے اور کسی کی خیر خواہی میں کوئی بات کہنا بھی ہے۔ آپ اپنے چھوٹے کو نصیحت کرتے ہیں کہ دیکھو بھائی یہ جو تم کر رہے ہو صحیح نہیں ہے۔ دیکھو سگریٹ چھوڑ دو‘ اس سے پیسے بھی ضائع ہوتے ہیں اور تم اپنے پھیپھڑے بھی جلا رہے ہو۔ یہ سب چیزیں نصیحت ہیں۔ تو نصیحت کا معنی اصل تو خیر خواہی اور وفاداری ہے‘ لیکن اسی خیر خواہی کے جذبے کے تحت آپ کسی کو مشورہ

دیتے ہیں تو وہ بھی نصیحت ہے اور اردو میں تو نصیحت کا لفظ صرف اسی معنی میں مستعمل ہے۔ تو حدیث کے الفاظ ہیں: ((اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ)) ''دین تو نام ہی نصیحت کا ہے''۔ قِیْلَ لِمَنْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟ ''پوچھا گیا: اے اللہ کے رسولﷺ! کس کے لیے نصیحت؟'' آپؐ نے جواباً ارشاد فرمایا: ((لِلّٰہِ وَلِکِتَابِہٖ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِھِمْ)) ''اللہ کے ساتھ' اُس کی کتاب کے ساتھ اور اُس کے رسولؐ کے ساتھ وفاداری اور مسلمانوں کے قائدین اور اُن کے عوام کے ساتھ نصح و خیر خواہی۔''

یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے۔ رسول اللہﷺ کا ارشاد ہے: ((اُوْتِیْتُ جَوَامِعَ الْکَلِمِ)) ''مجھے (اللہ کی طرف سے) بڑے جامع کلمات عطا کیے گئے ہیں۔'' آپﷺ کا اپنا دعویٰ ہے: ((اَنَا اَفْصَحُ الْعَرَبِ)) ''میں عرب کا فصیح ترین انسان ہوں''۔ عرب کی فصاحت اور بلاغت آپﷺ پر ختم ہے۔ آپؐ کے کلام سے بالاتر تو پھر صرف اللہ کا کلام ہے' کوئی اور انسانی کلام حضورﷺ کے کلام سے بالاتر نہیں ہے۔ اس مرتبہ میں نے اس حدیث کو اپنا موضوع بنا کر اس کے الفاظ پر غور کیا تو مجھ پر اس کی عظمت کا عجیب انکشاف ہوا۔ فرمایا گیا کہ تمہاری اولین وفاداری تو اللہ کی ذات کے ساتھ ہے' اس میں کوئی شک ہی نہیں۔

دوسری وفاداری اللہ کی کتاب کے ساتھ ہے۔ اور بڑی عجیب بات ہے کہ یہاں کتاب کو رسولؐ پر مقدم کیا گیا۔ یہ نکتہ قابل غور ہے۔ کتاب اللہ کو مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کا کلام ہمارے لیے ابد الآباد تک اللہ کے قائم مقام ہے۔ پھر اللہ کے رسولﷺ کے ساتھ وفاداری' چوتھے نمبر پر مسلمانوں کے قائدین اور اماموں کے ساتھ وفاداری اور نصیحت۔ یہاں بھی عجیب نکتہ ہے کہ ''اَئِمَّۃَ الْمُؤْمِنِیْنَ'' کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ ''اَئِمَّۃَ الْمُسْلِمِیْنَ'' کے ہیں۔ تم مسلمانوں کے اماموں' لیڈروں اور قائدوں کے روبرو سچی بات کہتے رہو۔ کسی کو اچھی لگے یا بری لگے اس کی کوئی فکر نہ کرو۔ جو تمہارے نزدیک صحیح بات ہے خیر خواہی کے جذبے کے تحت ضرور کہا کرو۔

اور آخر میں فرمایا: ((وَعَامَّتِھِمْ)) ''اور مسلمان عوام کے ساتھ نصح و خیر خواہی'' —— یہاں بھی نوٹ کیجیے کہ مسلمان عوام کو بعد میں لائے ہیں اور مسلمانوں کے قائدین کو پہلے۔ اس لیے کہ جو شخص بھی قائد ہے' وہ خواہ آپ کو پسند ہے یا نہیں' وہ مسلمانوں کا امام اور سربراہ تو ہے۔ اس کی

چھوٹی سی غلطی لاکھوں کروڑوں مسلمانوں پر اثر انداز ہو سکتی ہے اور اس کا چھوٹا سا صحیح عمل لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ائمۃ المسلمین کو عامۃ المسلمین سے مقدم کیا۔ گویا مسلمانوں کے ائمہ' قائدین' سربراہ' وہ لوگ کہ جن کی طرف مسلمان رہنمائی کے لیے دیکھتے ہیں یا جن کے ہاتھوں میں بالفعل ان کی زمامِ کار ہے انہیں خلوص' اخلاص اور وفاداری کے ساتھ مشورہ دینا اور عام مسلمانوں کو بھی صحیح مشورے دینا لازمی ہے۔

تو یہ پانچ ''نصیحتیں'' جو اس حدیث میں بیان ہوئی ہیں وہ میرے ایمان کا تقاضا ہے اور مجھ پر فرض کے درجے میں عائد ہیں۔ اب کیا مَیں ایک دینی فریضے سے محض اس وجہ سے رک جاؤں کہ یہ بات فلاں کو اچھی نہیں لگے گی' فلاں کو خواہ مخواہ مخالفت پر ابھار دے گی؟ یہی تو نہی عن المنکر باللسان کا فریضہ ہے جو مَیں ادا کر رہا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت جبکہ میری عمر کا ۶۳واں برس ہے' مَیں آخرت کی منزل سے قریب تر ہوں اور دنیا سے اپنی بساط لپیٹ رہا ہوں' مَیں پورے انشراحِ صدر کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ آج تک میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ میری بات کس کو اچھی لگے گی اور کس کو بُری لگے گی۔ مَیں نے ہمیشہ یہ دیکھا ہے کہ میرے نزدیک حق کیا ہے' میں اللہ کی عدالت میں اپنی بات کو justify کر سکوں گا یا نہیں؟ اور مَیں اپنے ضمیر کو اس کے اوپر مطمئن پاتا ہوں یا نہیں؟ اس کے سوا مجھے کسی کی پروا نہیں۔ کسی کو اچھا لگے کسی کو برا لگے۔ چاہے وہ ضیاء الحق کا دور تھا' چاہے ایوب خان کا دور تھا اور چاہے وہ بھٹو صاحب کا دور تھا' جو بات صحیح سمجھی ہے کہی ہے' چاہے وہ عوام کو بری لگے یا اچھی لگے' چاہے کسی قائد کو اچھی لگے یا بری لگے۔ اب جب بھی کوئی سیاسی مشورہ دیتا ہوں وہ لامحالہ وقتی طور پر کسی کے حق میں جاتا ہے اور کسی کے خلاف' تو اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سب کو معلوم ہے کہ میری کسی سے دوستی نہیں' کسی سے دشمنی نہیں' مَیں کسی کا حلیف نہیں' کسی کا حریف یا مخالف نہیں۔ ہماری دوستی صرف پاکستان اور اسلام کے ساتھ ہے۔ اور میں بیان کر چکا ہوں کہ ہم ان دونوں کو ایک وحدت سمجھتے ہیں' کیونکہ پاکستان کی وجہ جواز بھی صرف اسلام ہے اور اس کی بقا اور استحکام کا انحصار بھی صرف اسلام پر ہے۔ اس حوالے سے جان لیجیے کہ میرے نزدیک اس انقلابی جدّوجُہد کے ساتھ ساتھ' ملک اور قوم کے مسائل پر غور و فکر کرتے ہوئے' جسے میں نے نظری سیاست کہا ہے' اپنی آراء پیش کرنا میرا دینی فریضہ ہے اور میں نے ہمیشہ وہی کہا ہے جسے اس ملک کے حق میں بہتر سمجھا ہے۔

پاکستانی سیاست کے بارے میں مستقل موقف

اب اس ضمن میں مَیں کچھ مشورے پیش کر رہا ہوں۔ ان میں کچھ میرے مستقل مشورے ہیں اور میرے سننے والے اور پڑھنے والے گواہی دیں گے کہ جب سے وہ مجھ سے واقف ہیں وہ یہ مشورے سن رہے ہیں۔

میرا پہلا مستقل مشورہ اس ملک کے اعتبار سے یہ ہے کہ یہاں مارشل لاء کبھی نہیں آنا چاہیے۔ اس لیے نہیں کہ مارشل لاء حرام ہے۔ میرے نزدیک سارے مروّجہ نظام ایک جیسے حرام ہیں۔ مغربی جمہوریت سب سے بڑی حرام شے ہے۔ پوچھا جا سکتا ہے کہ پھر مارشل لاء سے کون سی قیامت آ جائے گی؟ یہ دراصل حلال وحرام کا مسئلہ نہیں ہے‘ بلکہ یہ مسئلہ ملکی حالات کے حوالے سے ہے۔ اسلام کی رو سے تو مغربی جمہوریت کفر ہے اور اس دور کا سب سے بڑا شرک ہے‘ کیونکہ وہ حاکمیت عوام کے تصور پر مبنی ہے۔ ہم تو خلافتِ عوام کے قائل ہیں‘ حاکمیتِ عوام کو شرک سمجھتے ہیں۔ لیکن ہم مارشل لاء کے اس لیے مخالف ہیں کہ مارشل لاء اس ملک کے لیے زہر قاتل ہے اور اس کا ایک خاص سبب ہے۔ ترکی جیسے ملک کے لیے یہ سم قاتل نہیں ہے‘ لیکن ہمارے لیے ہے۔ اس لیے کہ ہمارا یہ ملک اسلام کے نام پر‘ لیکن الیکشن کے ذریعے وجود میں آیا تھا۔ تو اس کی پیدائش (genesis) میں دو چیزیں شامل ہوئیں۔ ایک تو اسلام کا نعرہ ’’پاکستان کا مطلب کیا؟ لا اِلٰہ الا اللہ!‘‘ اور دوسرے ووٹ کا ذریعہ۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی فیصلہ کن کامیابی ہی سے پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا!

پھر اس مسئلے کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ہماری فوج ایک خاص علاقے سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی صوبہ سرحد کے وسطی اضلاع (مردان‘ کوہاٹ اور پشاور) اور پنجاب کے شمالی علاقوں سے۔ ہماری فوج میں نہ سندھ سے کوئی نفری شامل ہے نہ بلوچستان سے۔ لہٰذا جب بھی فوج کی حکومت قائم ہوتی ہے تو وہ ایک علاقے کی حکومت سمجھی جاتی ہے۔ اس سے دوسرے علاقوں میں ایک احساسِ محرومی پیدا ہو جاتا ہے کہ ایک خاص علاقہ ہم پر حکومت کر رہا ہے۔ اسی احساسِ محرومی نے ایوب خان کے زمانے میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے لیے فضا ہموار کی۔ ہمارے مشرقی پاکستانی بھائیوں کے جذبات یہ تھے کہ ہم پنجابی کے غلام بننے کے لیے تو پاکستان میں شامل

نہیں ہوئے تھے۔ یحییٰ خان کے مارشل لاء کو وہ ’’پنجابی فوج کی حکومت‘‘ کا نام دیتے تھے۔ بیچارے مولوی فرید احمد مرحوم کی اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے‘ وہ سچے مسلمان اور پکے پاکستانی تھے۔ وہ جب ڈھاکہ ایئر پورٹ پر اترے تو ان کے خلاف یہ نعرے لگائے گئے: ’’پنجابار دلال پھری جاؤ!‘‘ (اے پنجاب کے دلال واپس چلے جاؤ!) تمہیں یہاں ڈھاکہ ایئر پورٹ پر اترنے کا کوئی حق حاصل نہیں! اس لیے کہ ان کے نزدیک مارشل لاء کا مطلب پنجاب کی حکومت تھا۔ یہی مسئلہ آج بھی جوں کا توں موجود ہے۔

مارشل لاء کے بارے میں میرا یہ موقف اتنا مستقل ہے کہ جب ۱۸/اگست ۱۹۸۰ء کو ضیاء الحق مرحوم سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو میں نے اُسی وقت یہ کہا تھا کہ مارشل لاء اس ملک کے لیے خودکشی کے مترادف (suicidal) ہے۔ پھر ۱۹۸۲ء میں مَیں نے ضیاء الحق صاحب کی شوریٰ میں اعلانیہ طور پر کہا کہ اگر آپ نے یہاں انتخابی عمل کو روکے رکھا تو آپ ’’الذوالفقار‘‘ کی تشدد پرست سرگرمیوں کو جواز عطا کر دیں گے۔ ہم ’’پی ایل او‘‘ کو اپنی تشدد پسندانہ سرگرمیوں میں اسی لیے حق بجانب قرار دیتے ہیں کہ ان کے لیے کوئی اور راستہ کھلا نہیں رہا تھا۔ یہی معاملہ آج ہے کہ آپ نے الیکشن کا راستہ روک کر لوگوں کے لیے اظہارِ رائے اور اپنے حقوق کے حصول کا ذریعہ بند کر دیا ہے‘ جس کا ردِعمل ہو کر رہے گا۔ پھر دسمبر ۱۹۸۲ء میں تو مَیں نے انہیں وہ خط بھی لکھ دیا تھا‘ جو جنگ میں بھی چھپا تھا‘ کہ اگر آپ نے مارشل لاء کا یہ تسلسل برقرار رکھا تو مجھے اندیشہ ہے کہ مستقبل کا مؤرخ کہیں یہ نہ لکھے کہ ۱۹۴۷ء میں وقت کی جو عظیم ترین مسلمان مملکت قائم ہوئی تھی اسے پہلے تو ۱۹۷۱ء میں دولخت کیا ایک شرابی اور زانی ٹولے (یحییٰ خان اینڈ کمپنی) نے اور پھر اس کے مزید حصے بخرے ایک ایسے شخص کے ہاتھوں ہوئے جو نمازی اور پرہیزگار آدمی تھا۔ بہرحال مارشل لاء کے بارے میں میرا یہ موقف آج نہیں بنا بلکہ مستقل اور دائم ہے اور ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۳ء تک کم سے کم ۱۳ برس کا تسلسل تو میں ریکارڈ کے ساتھ ثابت کر سکتا ہوں۔

اس ضمن میں میرا دوسرا مشورہ یہ ہے کہ جب تک یہاں اسلامی انقلاب نہیں آتا‘ اسلامی ریاست قائم نہیں ہوتی‘ یہاں عہد حاضر کے معروف اور مسلّمہ معیارات پر سیاسی عمل یعنی انتخابی عمل کو جاری رہنا چاہیے۔ غیر مشروط‘ منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کا تسلسل ملکی سالمیت کے

لیے ناگزیر ہے۔ میری اس بات پر عام طور پر ایک اعتراض وارد کیا جاتا ہے کہ ایک طرف آپ کہتے ہیں کہ الیکشن کے ذریعے اسلام نہیں آ سکتا‘ دوسری طرف آپ کا موقف یہ ہے کہ الیکشن ہوتے رہنے چاہئیں‘ تو ان باتوں میں تضاد ہے۔ اس کا جواب میں ایک سادہ سی مثال سے دیا کرتا ہوں کہ ایک ہے کسی شخص کا مسلمان ہونا‘ ایک ہے اس کا زندہ رہنا۔ ان دونوں کے تقاضے جدا ہیں یا نہیں؟ زندہ رہنے کے لیے ہر انسان کو‘ خواہ وہ مسلمان ہو‘ ہندو ہو‘ سکھ ہو‘ پارسی ہو‘ عیسائی ہو‘ تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے‘ یعنی ہوا‘ پانی اور غذا۔ ان میں سے آپ ایک شے بھی روک دیں گے تو وہ مر جائے گا۔ ہوا رُک گئی تو چند منٹوں میں ختم‘ پانی رُک گیا تو چند دنوں میں ختم اور غذا رُک گئی تو شاید چند ہفتے گزار لے‘ لیکن آخر کار مر جائے گا‘ چاہے وہ مومن ہو چاہے کافر۔ تو یہ زندہ رہنے کے تقاضے ہیں‘ جبکہ مسلمان ہونے کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ اس کے لیے ایمان چاہیے۔ دل میں کسی قدر یقین والا ایمان ہوگا تبھی تو وہ مسلمان بنے گا۔ اسی پر قیاس کر لیجیے کہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے تقاضے کچھ اور ہیں (یعنی منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ پر مبنی انقلابی جدّوجُہد) اور پاکستان کی سالمیت کو برقرار رکھنے کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ اگر یہاں پر آپ نے انتخابی عمل کو روکے رکھا یا مشکوک بنا دیا جسے عوام کا اعتماد حاصل نہ ہوا تو یہ اس ملک کے لیے خودکشی کے مترادف ہے۔ اس کے نتیجے میں‘ خاکم بدہن‘ اس کے ٹکڑے ہو جائیں گے‘ حصے بخرے ہو جائیں گے۔ چنانچہ یہ عمل نہ صرف جاری رہنا چاہیے بلکہ اس انداز سے جاری رہنا چاہیے جیسے انگریزی کا مقولہ ہے:

"Justice should not only be done, it should also appear to have been done."

میرا تیسرا مشورہ اگرچہ ذرا ضمنی قسم کا ہے لیکن بہت اہم ہے۔ اور یہ بات شاید بعض لوگوں کو کڑوی بھی لگے۔ وہ یہ ہے کہ انتخابی میدان میں یا تو مذہب کا نعرہ کوئی نہ لگائے‘ اس لیے کہ اس طرح مذہب ایک الیکشن ایشو اور پارٹی ایشو بن جائے گا اور یہ بہت خوفناک بات ہے۔ اس طرح آپ کے سیاسی مخالف مقابلے میں آ کر لامحالہ مذہب کے خلاف بولنے پر مجبور ہو جائیں گے ------- اور اگر مذہب کا نعرہ لگانا ہی ہے تو اس کی شرطِ لازم یہ ہے کہ تمام مذہبی سیاسی جماعتیں متحد ہو کر ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر آ جائیں۔ اس طرح چونکہ ووٹ تقسیم نہیں ہوں گے‘ لہٰذا کامیابی کے کسی حد تک روشن امکانات ہوں گے۔ اگر آپ کو مذہب کی بنیاد پر ہی قوم کی سیاسی صف بندی

کروانی ہے تو یہ مذہب چار جگہوں پر تقسیم تو نہ ہو کہ یہ مولانا نورانی میاں کا مذہب ہے‘ یہ مولانا فضل الرحمٰن کا مذہب ہے‘ یہ قاضی حسین احمد کا مذہب ہے‘ اور یہ اہل حدیث حضرات کا مذہب ہے۔ اس صورت میں تو تباہی ہی تباہی اور بربادی ہی بربادی ہے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ہاں مذہبی سیاسی جماعتوں کا اس طرح کا اتحاد محال ہے‘ جو نہ کبھی ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ ہمارے ہاں تو یہ ہوتا ہے کہ ہر مذہبی جماعت کسی سیکولر جماعت کے ساتھ تو جڑ جاتی ہے لیکن دو مذہبی جماعتیں آپس میں نہیں جڑتیں۔ میرے نزدیک یہ بہت بڑی بات ہوئی ہے جو جمعیت علماء پاکستان (نورانی گروپ) اور جمعیت علماء اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) ابھی تک آپس میں جڑی ہوئی ہیں۔ لیکن ان کا اصل ٹیسٹ بھی الیکشن میں ہوگا۔ اگر انتخابات میں بھی یہ اتحاد برقرار رہا تب واقعی اسے اتحاد کہا جائے گا۔ اتحادی جماعتوں کا اصل جھگڑا ہی انتخابات میں ہوتا ہے اور یہ جھگڑا بسا اوقات صرف ایک سیٹ پر ہو جاتا ہے۔ اس وقت تو واقعی صورت حال یہ ہے کہ اتنے فرنٹ اور محاذ وجود میں آ چکے ہیں جتنی سیاسی جماعتیں ہیں‘ لہٰذا اس کا نتیجہ وہی ’’ڈھاک کے تین پات‘‘ کی صورت میں نکلے گا جو پہلے نکلتا رہا ہے کہ مذہب کے حامیوں کے ووٹ تقسیم ہو جائیں گے اور سیکولر قوتوں کو فتح حاصل ہو جائے گی۔ گویا ’’راج کرے گا خالصہ.....‘‘

ان تین مشوروں کی روشنی میں اب ہمیں بحالاتِ موجودہ کیا کرنا ہوگا! سب سے پہلی بات جو میں ۱۹۹۰ء کے الیکشن کے بعد کہہ رہا ہوں یہ ہے کہ اس الیکشن کا مینڈیٹ مشکوک تھا‘ لہٰذا ایک غیر جانبدارانہ نگران حکومت کے زیر انتظام نئے سرے سے الیکشن کرائے جائیں۔ مجھے بےنظیر کی قومی حکومت کی تجویز سے شدید اختلاف ہے‘ اس لیے کہ قومی حکومت کا چلانا بہت مشکل شے ہے۔ ہم تو یہاں ایک پارٹی کی حکومت نہیں چلا سکتے‘ قومی حکومت چلانا تو اس سے دس گنا زیادہ مشکل کام ہے۔ پھر یہ کہ اس قومی حکومت میں چونکہ سب پارٹیاں شریک ہوں گی لہٰذا ان کے لوگ اپنی اپنی پارٹیوں کے لیے کام کریں گے۔ میرے نزدیک غیر جانبدار حکومت یا تو ایسے ریٹائرڈ ججوں پر مشتمل ہو جن کی کوئی سیاسی وابستگیاں نہ ہوں‘ یا ایسے ریٹائرڈ فوجی جرنیلوں پر مشتمل ہو جو سیاسی وابستگیوں سے بالاتر ہوں اور فوج کی نگرانی میں انتخابات ہوں۔ اس ایک مسئلہ میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ وقتی طور پر بےنظیر کے ساتھ میرا اتفاقِ رائے ہے‘ یعنی فوج کے ذریعے سے انتخابات کرائے جائیں۔ آخر ہمارے ملک کے اندر کوئی ارضی یا سماوی آفت آ جاتی

ہے تو فوج کو بلاتے ہیں یا نہیں؟ کہیں کوئی سیلاب آ جائے یا زلزلہ آ جائے تو امدادی کارروائیوں کے لیے فوج کو طلب کیا جاتا ہے یا نہیں؟ چند برس قبل بشام اور کوہستان میں زلزلہ آیا تھا تو فوج ہی گئی تھی۔ پچھلے سال پنجاب میں سیلاب آیا تو فوج ہی آئی تھی۔ سندھ میں ڈاکوؤں کا مسئلہ تھا تو اس سے بھی تاحال فوج ہی نمٹ رہی ہے۔ انتخابات کا مسئلہ تو ان سب سے بڑا مسئلہ ہے کہ اس ملک میں سیاسی عمل جو کہ پٹڑی سے اترا ہوا ہے اس کو صحیح لائن پر چڑھایا جائے۔ تو میرے نزدیک انتخابات کے لیے فوج کی خدمات حاصل کرنا لازم ہے‘ اسی سے اعتماد قائم ہوگا اور الیکشن منصفانہ ہوں گے۔

اب یہ بھی جان لیجیے کہ ۱۹۹۰ء کے انتخابات کا مینڈیٹ میرے نزدیک کن بنیادوں پر مشکوک ہے؟ ایک یہ کہ وہی غلام اسحاق خان جس کے اس وقت خاکے اُڑ رہے ہیں‘ کارٹون بن رہے ہیں‘ جس کو تھوک کے حساب سے گالیاں دی جا رہی ہیں اس نے اُس وقت بھی ایسا ہی کھیل کھیلا تھا جو کچھ لوگوں کے حق میں پڑ گیا تو اسے بہت ہی نیک‘ مدبر اور سینئر سیاستدان کہا گیا اور آج اس کا کھیل کسی کے خلاف چلا گیا تو گویا ہر برائی اس کے سر آ گئی۔ آدمی تو وہی ہے یا نہیں؟ کیا اس کی سرشت بدل گئی کہ پہلے فرشتہ تھا‘ اب شیطان ہو گیا۔ وہی آدمی ہے‘ یہی کھیل اس نے اُس وقت کھیلا تھا۔ ایک مخالف پارٹی کے جو بدترین دشمن ہو سکتے تھے ان سب کو نگران حکومتوں میں بٹھا دیا تو ایسی نگران حکومتوں کے تحت ہونے والے الیکشن پر کوئی اعتماد ہو سکتا ہے؟ دوسرے یہ کہ اب یہ راز طشت از بام ہو چکا ہے کہ ’’آئی جے آئی‘‘ (اسلامی جمہوری اتحاد) آئی ایس آئی نے بنوائی تھی۔ ملک کے سب سے زیادہ حساس ادارے کے سب سے بڑے حساس شعبے نے سیاست میں عمل دخل دیا اور الیکشن کے لیے ’’آئی جے آئی‘‘ بنوائی۔ تو کیا اب بھی آپ کہیں گے کہ الیکشن کا مینڈیٹ صحیح تھا؟ تیسرے یہ کہ ’’شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا‘‘ کے مصداق خود اُس وقت کے نگران وزیر اعظم کا کہنا ہے کہ دھاندلی ہوئی ہے۔ اور آخری بات کہہ رہا ہوں کہ یہ مینڈیٹ جیسا کچھ بھی تھا وہ کسی پارٹی یا کسی شخص کو نہیں ملا تھا‘ بلکہ وہ ’’آئی جے آئی‘‘ کو ملا تھا اور اسلام کے نام پر ملا تھا۔ نہ یہ نواز شریف کو ملا تھا اور نہ مسلم لیگ کو۔ وہ مشکوک مینڈیٹ بھی اب ختم ہو چکا‘ کیونکہ آئی جے آئی سے ’’جے آئی‘‘ (جماعت اسلامی) بھی نکل چکی ہے اور ’’جے یو آئی‘‘ (جمعیت علماء اسلام) بھی۔ اب اس میں رہ کیا گیا؟

جماعت اسلامی بحیثیت مجموعی‘ اور جے یو آئی‘ اہل حدیث اور جے یو پی کے دھڑے جمع ہو گئے تو ’’آئی جے آئی‘‘ بنی تھی جس نے مذہب کے نام پر الیکشن لڑا۔ الیکشن جیت کر نواز شریف نے مذہب سے غداری کی۔ اس نے ’’نفاذِ شریعت ایکٹ‘‘ وہ پاس کروایا جس میں سود کو برملا جاری رکھنے کا اعلان کیا۔ اسی لیے میاں طفیل محمد صاحب نے برسرِعام اپنی جماعت کی قیادت کو ڈانٹا تھا کہ ’’تمہاری مت ماری گئی تھی کہ تم نے اس نام نہاد نفاذِ شریعت ایکٹ پر دستخط کر دیے؟‘‘ تو اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت میں یہ تماشا بھی ہوا کہ سود کو جاری رکھنے کے لیے ایک قانون بنایا گیا اور اس کا نام ’’نفاذِ شریعت ایکٹ‘‘ رکھا گیا۔ پھر ’’آئی جے آئی‘‘ سے جماعت اسلامی بھی علیحدہ ہو گئی اور جے یو آئی بھی تو ’’آئی جے آئی‘‘ بھی ختم ہوئی۔ گویا اول تو واقعہ یہ ہے کہ وہ مینڈیٹ تھا ہی داغدار‘ مشکوک اور ناقابل اعتماد‘ پھر جتنا تھوڑا سا تھا وہ بھی ان اسباب کی بناء پر ختم ہو چکا جو میں نے ابھی گنوائے ہیں۔ لہٰذا موجودہ حکومت کے قائم رہنے کا کوئی جواز ہے ہی نہیں۔

مَیں اس سے کوئی بحث نہیں کر رہا کہ صدر نے جو اسمبلی توڑی تو صحیح توڑی یا غلط‘ نہ مَیں عدالت عظمیٰ کے فیصلہ پر کوئی تبصرہ کر رہا ہوں‘ نہ اس پر اظہارِ رائے کر رہا ہوں کہ اسے اس کا حق حاصل تھا یا نہیں۔ میرے نزدیک تو جڑ بنیاد ہی سے یہ حکومت کوئی حقیقی جواز نہیں رکھتی۔ چنانچہ بہترین صورت یہ ہے کہ جلد از جلد اس ملک کے اندر عام انتخابات کروائے جائیں۔ ہمارا سیاسی بحران روز بروز گہرے سے گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ دنیا میں پاکستان کا مذاق اُڑ رہا ہے۔ جو کچھ آج ہو رہا ہے ایسا آج تک کبھی نہیں ہوا تھا۔ ویسے تو ہماری سیاسی تاریخ کا اس سے بھی بدتر باب ملک غلام محمد جیسے بیوروکریٹ کا دور تھا‘ لیکن اس کی باتیں اکثر و بیشتر لوگوں کے علم میں نہیں آئی تھیں اور ویسے بھی اُس وقت تک عالمی پریس اور ذرائع ابلاغ میں پاکستان کا ابھی اتنا چرچا نہیں تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا وہ ڈھکا چھپا کچھ لوگوں کو معلوم تھا۔ یہ تو اب ’’شہاب نامہ‘‘ میں پڑھیے کہ اُس وقت کون شخص کس طور سے حکومت کر رہا تھا۔ ایک مفلوج شخص جس کی رال ٹپکتی رہتی تھی اور بات کر نہیں سکتا تھا وہ یہاں کے گورنر جنرل کی حیثیت سے مختارِ مطلق بن کر بیٹھا ہوا تھا۔ اسی طرح کا مسئلہ آج ہے‘ دنیا کے اندر پاکستان کی بہت رسوائی ہو رہی ہے۔ آپ کی ایڈمنسٹریشن کا بیڑا غرق ہو چکا ہے۔ اب اس کو اسی طریقے سے طول دینا ملک کے حق میں ہرگز مفید نہیں ہے‘ بلکہ سخت نقصان دہ ہے۔ چنانچہ یہاں عام انتخابات جلد از جلد ہونے چاہئیں۔ اور قومی و صوبائی اسمبلیوں

کے انتخابات ایک ہی دن میں ہونے چاہئیں۔

مجھے یہ ملک اسلام کے مستقبل کے اعتبار سے بہت عزیز اور بہت پیارا ہے۔ اس حوالے سے نعیم صدیقی صاحب کا وہ شعر میں نے بارہا سنایا ہے ؎

اے آندھیو سنبھل کے چلو اِس دیار میں!
اُمید کے چراغ جلائے ہوئے ہیں ہم

اس مملکت میں ابھی تک ہماری امید کے چراغ جل رہے ہیں۔ شاید اللہ تعالیٰ اس قوم کا رخ درست کر دے‘ زبردستی اسے سیدھے راستے پر ڈال دے اور اسے اس منزل کی جانب موڑ دے جس پر پہنچنے کے ارادے سے سفر کا آغاز کیا گیا تھا کہ ع ’’کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو‘‘۔ اس لیے کہ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا تھا اور بے شمار قربانیاں دے کر بنا تھا۔ اور پھر اس خطے کی چار سو برس کی تاریخ میرے سامنے ہے۔ گیارہویں صدی ہجری سے لے کر چودھویں صدی ہجری تک چار سو برس کا تجدیدِ دین کا جو سارا اثاثہ ہے اس کی وارث یہی سرزمین پاک و ہند ہے۔ حضرات مجدد الف ثانی‘ شاہ ولی اللہ دہلوی‘ سید احمد بریلوی اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ جیسے مجددینِ ملت اسی سرزمین میں پیدا ہوئے۔ چودھویں صدی ہجری کے دوران شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے علاوہ علامہ اقبال جیسے مفکرؒ‘ مولانا مودودیؒ جیسے مصنف اور مولانا الیاسؒ جیسے مبلغ کے برابر کی شخصیتیں پورے عالَمِ اسلام میں کہیں نظر نہیں آتیں۔ یہ بہت بڑا ورثہ ہے‘ بہت بڑی وراثت ہے جس کی یہ قوم امین ہے۔

اس ضمن میں بھارت کے مسلمان نے تو پاکستان بنوا کر گویا اپنا فرضِ کفایہ ادا کر دیا تھا‘ اب ذمہ داری کا سارا بوجھ پاکستانی مسلمان کے کندھے پر ہے۔ اسے کاش کہ احساس ہو جائے‘ کاش کہ ہوش آجائے! لیکن اگر خدانخواستہ یہ ملک ہی ٹکڑے ہو گیا‘ ملکی سالمیت ہی باقی نہ رہی‘ کوئی حصہ سندھو دیش بن گیا‘ کوئی گریٹر بلوچستان میں ضم ہو گیا‘ کوئی پختونستان میں جذب ہو گیا اور کوئی سکھا شاہی کی نذر ہو گیا تو قیامِ نظامِ اسلام کا خواب کیسے شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا؟ میں نے سکھا شاہی کی بات اس لیے کی ہے کہ مَیں یہ یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ خدانخواستہ پاکستان کی سالمیت کو نقصان پہنچا اور اس کی balkanization ہوئی تو سب سے بڑی آفت پنجاب پر آئے گی اور وہ آفت سکھا شاہی کے دوبارہ لوٹ آنے کی صورت میں ہوگی۔ اس لیے کہ سکھ اس

وقت بہت بڑی زندہ قوم بن چکے ہیں۔ انہوں نے خالصتان کی تحریک کو اپنے خون سے سینچا ہے۔ اس دور میں سب سے زیادہ خون افغان قوم نے دیا ہے اور اس کے بعد سکھ قوم نے‘ اور یہ حقیقت ہے کہ جو قوم خون دینا سیکھ لے اس میں بڑی جان پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ سکھ قوم اگر کبھی اٹھ کھڑی ہوئی تو اس کی یلغار کا رخ مغربی پنجاب کی طرف ہوگا۔ ستلج کے پار تو اس کی عظمت کبھی رہی ہی نہیں۔ اس کی اصل عظمت کے نشان تو اسی مغربی پنجاب میں ہیں۔ ان کے ہیرو رنجیت سنگھ کی سمادھی لاہور میں بادشاہی مسجد اور شاہی قلعہ کے درمیان موجود ہے۔ اسی طریقے سے بابا گرونانک کی جنم بھومی ننکانہ صاحب ضلع شیخوپورہ میں ہے۔ پنجہ صاحب شمالی پنجاب میں ہے۔ ہری پور‘ ہری سنگھ نلوہ کا آباد کردہ شہر ہے اور مانسہرہ راجہ مان سنگھ کا ’’سہرا‘‘ ہے۔ ان کی تو ساری عظمت رفتہ کی تاریخ یہیں سے وابستہ ہے‘ اُدھر کیا ہے؟ تو اللہ نہ کرے‘ خاکم بدہن‘ اس ملک کو اب کوئی زک پہنچی تو سب سے بڑا نقصان پنجاب کو برداشت کرنا ہوگا‘ کیونکہ اس کے حصے میں سکھا شاہی آئے گی۔ باقی جس کا جو حشر ہوگا وہ ہوگا۔ سندھ شاید سب سے زیادہ نفع میں رہے کہ وہ ساحل سے ملحقہ علاقہ ہے‘ خشکی میں محصور (land locked) تو نہیں ہے۔ بلوچستان بھی نفع میں رہے گا کیونکہ اس کے پاس ساحل کے علاوہ بے حساب معدنی دولت بھی ہے جس کی وہ بڑی سے بڑی قیمت وصول کر سکتا ہے۔ پٹھانوں کے لیے پختونستان بن سکتا ہے جس کے لیے نسلی اور لسانی بنیاد موجود ہے۔ گویا وہی بات ہوگی جو کبھی اکبر الٰہ آبادی نے کہی تھی ؎

مرزا کے اتحاد کو مجلس کی ہائے ہے
ہندو کے اتحاد کو گنگا ہے گائے ہے
پر شیخ جی کے واسطے مرکز کوئی نہیں
ہر پیر ہر جواں کی جداگانہ رائے ہے

بہرحال اللہ نہ کرے کہ وہ برا دن آئے۔

اور مَیں یہ مشورہ جو دیتا ہوں کہ اس ملک میں دنیا کے مسلّمہ معیارات کے مطابق منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابی عمل کو جاری رہنا چاہیے وہ اسی لیے ہے کہ اگرچہ اس عمل سے اسلام نہیں آئے گا‘ لیکن یہ ملک تو باقی رہے گا اور اس کے استحکام کے لیے اسلام کی جدّوجُہد کرنے کے مواقع باقی رہیں گے۔ اور اگر خدانخواستہ اس ملک کے حصے بخرے ہو جائیں‘ یا خاکم بدہن‘

کہیں یہاں اغیار کی بالادستی قائم ہو جائے تو معاذ اللہ ثم معاذ اللہ‘ ہو سکتا ہے یہاں سپین کی تاریخ دہرائی جائے اور جنوبی ایشیا سے مسلمانوں کے خاتمے کے لیے ان کے نسلی صفایا (ethnic cleansing) کا وہی عمل شروع ہو جائے۔ میری کتاب ’’استحکامِ پاکستان اور مسئلہ سندھ‘‘ میرے ان مضامین پر مشتمل ہے جو پہلے روزنامہ ’’جنگ‘‘ میں چھپے تھے۔ اس کتاب کے سیکنڈ ٹائٹل پر میں نے یہ جملہ لکھا تھا:

’’۹۳ھ مطابق ۷۱۲ء میں اسلام بیک وقت برعظیم ہند میں براستہ سندھ (محمد بن قاسمؒ کی قیادت میں) اور برعظیم یورپ میں براستہ سپین (طارق بن زیادؒ کی قیادت میں) داخل ہوا تھا۔ سپین سے اسلام اور مسلمانوں کا خاتمہ ہوئے پانچ سو برس ہو چکے ہیں! کیا اب وہی تاریخ سندھ میں بھی دہرائی جانے والی ہے؟‘‘

آپ کو معلوم ہے کہ سپین میں مسلمانوں کی حکومت ۸۰۰ برس تک رہی تھی لیکن پھر وہاں سے اسلام اور مسلمانوں کا صفایا ہو گیا۔ خدانخواستہ‘ خدانخواستہ اگر پاکستان قائم نہ رہا تو بعینہ وہی تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی اور اس علاقے سے اسلام‘ پاکستان اور مسلمانوں کے نام کا خاتمہ ہو جائے گا۔ میرا یہی احساس مجھے مجبور کرتا ہے کہ ملکی سیاسی حالات کے تناظر میں جو بھی سیاسی مشورہ میں صحیح سمجھتا ہوں وہ مَیں دیتا ہوں اور اسے اپنا ایک دینی فریضہ سمجھ کر دیتا ہوں۔

اس سلسلے کی آخری بات مجھے یہ کہنی ہے کہ ملک کی سیاسی صورت حال میں اس وقت جو تبدیلی آئی ہے اس کا بھی ہمیں پوری طرح شعور حاصل ہونا چاہیے۔ اس تبدیلی کا خوش آئند پہلو یہ ہے کہ نواز شریف صاحب بھی اپنی ذاتی حیثیت میں ایک قومی قائد بن کر سامنے آ چکے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک ہمارے ہاں ایک خلا تھا‘ کیونکہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہاں سیاسی قوت ایک ہی ہے اور وہ ہے بےنظیر اور پیپلز پارٹی۔ اس کے مقابلے میں کوئی دوسری سیاسی قوت موجود نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ پیپلز پارٹی کا مقابلہ ہمیشہ ’’آئی جے آئی‘‘ جیسے اتحاد بنا کر کیا گیا۔ لیکن اب نواز شریف صاحب اپنی ذاتی حیثیت میں ایک قومی لیڈر بن چکے ہیں اور ملک کا ایک خاص طبقہ یعنی تاجر اور صنعت کار طبقہ ان کی پشت پر ہے اور شہروں کے اندر سیاست اسی طبقے کے ہاتھ میں ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ نواز شریف صاحب کے لیے فریش مینڈیٹ لینے کا یہ بہترین موقع ہے۔ مَیں نے انہیں ایک مشورہ اُس وقت بھی دیا تھا جب مرکز میں بےنظیر کی حکومت بنی تھی اور

وہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنے تھے کہ خدا کے لیے آپ وزارتِ اعلیٰ کو اہمیت نہ دیں‘ بلکہ آپ مسلم لیگ کو منظم کریں۔ خدا نے آپ کو اس کی صلاحیت دی ہے‘ آپ محنت کر سکتے ہیں‘ بھاگ دوڑ کر سکتے ہیں لہٰذا آپ پارٹی کو منظم کریں۔ آج مَیں ان کو یہ مشورہ دے رہا ہوں کہ انہیں عام انتخابات کروا کے نئے سرے سے عوامی مینڈیٹ حاصل کر لینا چاہیے۔ اس وقت ملک میں ان کے حق میں جتنی فضا سازگار ہے شاید اس کے بعد یہ پوزیشن برقرار نہ رہے۔ اس لیے کہ چاہے پارلیمانی سیاست ہو یا صدارتی سیاست‘ دنیا کے مروّجہ اور مسلّمہ سیاسی معیارات کے اعتبار سے جمہوری نظام میں دو مستحکم سیاسی پارٹیوں کا ایک دوسرے کے مدمقابل ہونا ضروری ہے۔ اگر ایک ہی پارٹی ہو گی تو سیاست کی گاڑی نہیں چلے گی۔ سیاست کے میدان میں ابھی مونوریل (monorail) دریافت نہیں ہوئی۔ اس میدان میں تو دو پہیے چاہئیں۔ اور مَیں سمجھتا ہوں کہ اب ان میں وہ بصیرت بھی پیدا ہو چکی ہے جو ایک سیاسی قائد کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

انہوں نے بڑی پیاری بات کہی ہے کہ اب ہمیں یہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں کہ کون مارشل لاء کی چھتری کے نیچے پروان چڑھا اور مارشل لاء کا سہارا لے کر اقتدار میں آیا تھا۔ چونکہ ان کو یہ گالی دی جاتی تھی کہ یہ تو درحقیقت ضیاء الحق صاحب کے پروردہ ہیں‘ ان کے مارشل لاء کا دودھ پی کر جوان ہوئے ہیں تو انہوں نے اس کا ترکی بہ ترکی جواب دیا ہے کہ بےنظیر کا باپ ذوالفقار علی بھٹو بھی تو مارشل لاء کی چھتری کے نیچے پروان چڑھا تھا اور جب بھٹو کی حکومت بنی تھی تب بھی سویلین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے۔ لہٰذا ان بحثوں کو چھوڑ دو‘ ان کا کوئی فائدہ نہیں۔ اب تو آگے کی بات کرنی چاہیے کہ دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کے مقابل آئیں‘ الیکشن لڑیں‘ ایک کو حکومت کا مینڈیٹ ملتا ہے تو دوسرا اسے تسلیم کرے اور اپوزیشن کا کردار ادا کرے۔ اپوزیشن کا رول بھی مثبت ہونا چاہیے‘ جو آج کل کے سیاسی عمل کے لیے ضروری ہے۔ میں اس تبدیلی کو اس اعتبار سے خوش آئند قرار دے رہا ہوں کہ اب ہمارے ملک کی پارلیمانی سیاست کی گاڑی پٹڑی پر چڑھ سکتی ہے جو کہ پٹڑی سے اتر گئی تھی۔

البتہ اس تبدیلی کا دوسرا پہلو تشویشناک ہے اور وہ اس اعتبار سے کہ اس ملک میں پہلی مرتبہ تاجروں اور صنعت کاروں کو ہیرو ملا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ نواز شریف صاحب کی سیاست کا اصل محور تاجر برادری اور صنعت کار ہیں۔ اب تک یہ تاجر برادری اور صنعت کار پیپلز پارٹی کے

مقابلے میں کچھ دوسری مذہبی اور دینی جماعتوں سے تعاون کرتے تھے‘ انہیں اپنی حمایت کا یقین دلاتے تھے‘ انہیں چندے دیتے تھے‘ ان کے لیے استقبالیے منعقد کرتے تھے۔ یہ سب اس امید پر تھا کہ یہ مذہبی جماعتیں ان کے لیے پیپلز پارٹی کے مقابلے میں ڈھال ثابت ہوں گی۔ چونکہ پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت میں نیشنلائزیشن کے نام پر صنعت کاروں کو خاص طور سے اپنے کارخانوں سے محروم ہونا پڑا تھا لہٰذا اس سے بچاؤ کے لیے وہ مذہبی جماعتوں کی چھتری کے نیچے پناہ ڈھونڈتے تھے۔ لیکن اب وہ وہاں سے کھسک کر نواز شریف صاحب کے تھیلے میں جا رہے ہیں۔ اس سے مذہبی قوتوں کو ضعف پہنچنے کا حقیقی خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس پر تو مجھے کوئی تشویش نہیں ہے‘ بلکہ جو مذہب کے نام پر اپنی دکان چمکا رہے تھے انہیں تشویش ہوگی‘ لیکن مجھے بھی اس اعتبار سے تشویش ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے کہ سود حرام ہے‘ لیکن اس کے بغیر معیشت کی گاڑی نہیں چلتی۔ یہ کلمہ دینی اعتبار سے بہت بڑا باغیانہ کلمہ ہے اور یہ انتہائی تشویش ناک امر ہے کہ یہ بات اب تاجروں اور صنعت کاروں کی زبان پر بلا جھجک آ جاتی ہے۔ وہ برملا کہہ دیتے ہیں کہ سود ہماری معیشت کا لازمی جزو بن چکا ہے‘ اس کے بغیر گاڑی نہیں چل سکتی اور ہمیں اپنی گاڑی چلانی ہے۔ آپ اپنے فتوے اپنے پاس رکھیے! یہ انداز یقیناً اس ملک میں اسلام کے مستقبل کے اعتبار سے خوفناک ہے۔

مزید برآں اب نواز شریف صاحب اسلام کا نام بھی نہیں لیتے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے حالات کو بھانپ لیا ہے اور انہیں محسوس ہو گیا ہے کہ عام آدمی کو تو صرف اپنی معاشی بہتری سے دلچسپی ہے‘ لہٰذا اب اپنی حالیہ تقریروں میں انہوں نے اسلام کا نام تک نہیں لیا۔ دوسری طرف انہیں اس کا بھی خطرہ ہے کہ اگر اسلام کا نام لیا تو امریکہ کے کاغذات میں فنڈامنٹلسٹ کی حیثیت سے نام درج ہو جائے گا اور یہ دھمکی تو خود امریکہ کا ایئر چیف یہاں آ کر دے گیا ہے کہ امریکہ کی حیثیت اس وقت ایک مست ہاتھی کی سی ہے‘ جو بھی اس کے سامنے آئے گا کچلا جائے گا۔ چنانچہ اب نواز شریف صاحب اسلام کے نعرے اور اسلام کے نام سے بھی کنی کتراتے ہوئے امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے ملک میں سود کو اتنے وسیع پیمانے پر عام کر دیا ہے کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ ”روزگار سکیم اور ییلو کیب“ کے نام پر لاکھوں نوجوانوں کو سودی کاروبار میں ملوث کر دیا ہے۔ اب تک تو صرف تاجر‘ صنعت کار اور

کاروباری لوگوں کی اس پر اجارہ داری تھی کہ بینکوں سے قرضے لیں اور کاروبار چمکائیں۔ نواز شریف صاحب نے خود کہا ہے کہ یہ درست ہے کہ ہم نے کارخانے بنائے ہیں‘ لیکن ہم نے قرضے لیے‘ ان پر سود ادا کیا۔ گویا کہ دھڑلے سے کہہ رہے ہیں کہ ہم نے یہ حرام کام کیا اور اس کی بنا پر ہم نے اپنے کاروبار چمکائے۔

اب نواز شریف صاحب مغرب کے کاروباری اصولوں کو اپناتے ہوئے فری مارکیٹ اکانومی قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کو ہاتھ جوڑ جوڑ کر سرمایہ کاری کی دعوت دے رہے ہیں۔ امریکہ نے تو خود ہی امداد بند کر دی تو آپ نے ”کشکول توڑ دیا“‘ لیکن اس کے بدل کے طور پر آپ ملٹی نیشنلز کو جو لا رہے ہیں تو یہ امریکہ سے بڑی لعنت ہیں۔ ان کی اکثریت یہود کی آلۂ کار ہے جو اپنے ہتھکنڈوں سے ملکوں کی معیشت کو تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ مجھے نعیم صدیقی صاحب کی ایک نظم کے چند مصرعے یاد آ رہے ہیں جو انہوں نے ۱۹۵۱ء میں کہی تھی ؎

ڈالر مرے اس دیس کو ناپاک نہ کرنا!
تُو ظلم کا حاصل
تُو سحرِ ملوکانہ کا اک شعبدۂ خاص
تُو سود کا فرزند!
تُو آئے تو ڈالر!
سو عیش تو ہوں گے‘ سکھ چین اڑیں گے
جامے تو سلیں گے‘ تن کم ہی ڈھکیں گے
اس دیس میں تُو آئے تو اے سونے کے ڈالر
آئے گا رِبا بھی
پھیلے گا جُوا بھی
چھائے گا زنا بھی
اُڑ جائے گا ہر پھول سے پھر رنگِ حیا بھی

کیونکہ مغربی سرمایہ دارانہ نظام میں تو یہی کچھ ہوتا ہے اور اس کا نقشہ آپ جا کر امریکہ میں دیکھ سکتے ہیں کہ وہاں غلاظت کے ڈھیروں پر بھی انسان رہ رہے ہیں‘ جبکہ کچھ لوگوں کے پاس اس

قدر دولت ہے کہ وہ چالیس چالیس بلین ڈالر کا ایک چیک لکھ سکتے ہیں۔ تو مغربی سرمایہ دارانہ نظام اپنانے سے تو یہی کچھ ہوگا کہ دولت کا ارتکاز چند ہاتھوں میں ہوتا چلا جائے گا اور سود کی لعنت جسے قرآن ’’اللہ اور اُس کے رسولؐ سے جنگ کا الٹی میٹم‘‘ قرار دیتا ہے‘ ملکی معیشت کے رگ و ریشے میں سرایت کرتی چلی جائے گی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارا عام آدمی بھی سود کے حق میں بات کرتا ہے۔ یہ صورت حال ہمارے لیے تشویش کا باعث ہے۔ لیکن بہرحال ہم چاہتے ہیں کہ سیاست میں جمود نہ ہو اور ملکی سیاست کی گاڑی دو پہیوں پر چلے۔ ہماری مذہبی سیاسی جماعتوں کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی حکمت عملی اور طریق کار پر نظر ثانی کریں۔

پاکستان کی مذہبی جماعتوں کا جائزہ

اپنی گفتگو کے آخری حصے میں مجھے پاکستان کی مذہبی جماعتوں کے بارے میں اپنا جائزہ پیش کرنا ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مذہبی جماعتوں سے میری مراد مذہبی سیاسی جماعتیں ہیں۔ قبل ازیں میرے بعض خطابات اور انٹرویوز کی اخباری رپورٹنگ سے بعض مذہبی حلقوں نے بڑا برا منایا ہے‘ لہٰذا یہ وضاحت کر رہا ہوں کہ وہ مذہبی جماعتیں جو تبلیغ و اشاعت کا کام کر رہی ہیں یا اصلاحِ عقائد اور اصلاحِ اعمال وغیرہ کی نوعیت کے کام کر رہی ہیں وہ ہماری اس بحث سے خارج ہیں۔ مَیں چونکہ پاکستان کی سیاست کے بارے میں تجزیہ کر رہا ہوں لہٰذا اس اعتبار سے ان مذہبی جماعتوں کے بارے میں بھی جن کا اس ملک میں کوئی سیاسی رول بھی ہے‘ اپنا موقف بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

اس ضمن میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس ملک میں ’’دینی اور انقلابی تحریک‘‘ صرف ایک تھی اور وہ جماعت اسلامی تھی۔ یہاں ’’دینی‘‘ اور ’’انقلابی‘‘ کے الفاظ کی اہمیت پیش نظر رہے۔ میرے نزدیک جماعت اسلامی ایک ’’مذہبی‘‘ نہیں ’’دینی‘‘ اور ایک ’’سیاسی جماعت‘‘ نہیں بلکہ ’’انقلابی تحریک‘‘ تھی۔ لیکن اب جو صورت حال ہے وہ بالکل مختلف ہے۔ اس نے سیاست کے میدان میں آ کر اپنا ’’دینی‘‘ اور ’’انقلابی‘‘ ہونے کا کردار داغدار کر لیا ہے۔

باقی سب مذہبی جماعتوں میں دو وصف لازمی طور پر پائے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ ’’دینی‘‘ نہیں ’’مذہبی‘‘ ہیں‘ یعنی ان کے سامنے نظام کا تصوّر نہیں ہے بلکہ دین صرف شریعت کے درجے

میں ہے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ فرقہ وارانہ ہیں اور فرقہ وارانہ بنیاد پر سیاست کرتی ہیں۔ اہلحدیث‘ بریلوی اور دیوبندی مسلک کی جماعتیں اپنے اپنے فرقے کے نعرے لگا کر ووٹ لیتی ہیں۔ لہٰذا جہاں جہاں ان کے کچھ فرقہ وارانہ اثرات اور کچھ دائرۂ اثر و نفوذ ہے وہی ان کا سیاسی دائرہ کار ہے۔ میرے نزدیک ان کی اصل حیثیت علماء کی ٹریڈ یونینز کی ہے۔ جیسے ہر شعبے کی ٹریڈ یونینز ہوتی ہیں‘ ڈاکٹروں کی یونینز‘ کلرکوں کی یونینز‘ اساتذہ کی یونینز‘ اسی طرح چونکہ مذہب بھی ہمارے ہاں ایک پیشے (profession) کا درجہ اختیار کر گیا ہے لہٰذا ان فرقہ وارانہ مذہبی جماعتوں کی حیثیت بھی ٹریڈ یونینز کی ہے‘ البتہ جہاں کہیں ان کا حلقۂ اثر ہے وہاں یہ سیاست بھی کرتی ہیں۔ تاہم ایک جماعت اس سے مستثنیٰ ہے۔ وہ خالص غیر سیاسی بھی ہے اور فرقہ واریت سے بالاتر بھی‘ مزید برآں تحریک بھی ہے اگرچہ انقلابی نہیں۔ یہ تبلیغی جماعت ہے۔ یہ ایک مذہبی تحریک ہے‘ ان کے ہاں دین یا نظام کا تصور نہیں ہے۔ ان کا سارا تصور مذہبی ہے جو عبادات‘ اتباعِ سنّت اور فضائل اعمال وغیرہ تک محدود ہے۔ اسے آپ ایک اصلاحی تحریک کہہ سکتے ہیں لیکن دینی تحریک اس معنی میں نہیں کہ نظام کو بدلنے میں کوشاں ہو۔

ان سب کے بعد چوتھے نمبر پر ہماری تنظیم اسلامی یا تحریک خلافت ہے جو حجم کے اعتبار سے ابھی کسی شمار قطار میں نہیں۔ ہمیں چاہے کوئی پانچوں سوار کہہ لے چاہے ساتواں سوار کہہ لے یا کوئی اور توہین آمیز لفظ استعمال کرنا چاہے‘ ہمیں قبول ہے۔ مَیں اپنے بارے میں یا تنظیم اسلامی یا تحریک خلافت کے بارے میں کسی مغالطے کا شکار نہیں ہوں۔ لیکن اصولی اعتبار سے تنظیم اسلامی علامہ اقبال‘ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا مودودی کے دینی انقلابی فکر کا تسلسل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہماری کوشش یہ ہے کہ اس اصولی انقلابی فکر کے ساتھ تبلیغی جماعت کا تدیّن‘ اس کا تعبدی انداز‘ عبادات سے شغف اور اتباعِ سنّت کے جذبہ کا عنصر جمع کر دیا جائے۔ رہی یہ بات کہ ہم اس میں کس درجے میں کامیاب ہوں گے یا ہوئے ہیں تو اس کا فیصلہ ہم نہیں کر سکتے‘ بلکہ یہ فیصلہ تو وقت کرے گا یا مستقبل کا مؤرخ۔ تاہم مجھے یہ یقین حاصل ہے کہ اپنی اس نیت اور ارادے کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے سامنے سرخرو ہوں گا کہ میں نے اپنے امکان بھر جو کوشش کی تھی وہ یہ تھی کہ جماعت اسلامی کے اصولی دینی انقلابی فکر اور تبلیغی جماعت کے تعبدی انداز کو ایک جماعت میں جمع کر دیا جائے۔ یعنی یہ تصوّر بھی واضح رہے کہ دین اور دنیا ایک

وحدت ہیں اور دین کے اجتماعی نظام کو قائم کرنا اور دین کے غلبہ کی جِدّوجُہد کرنا ہمارا فرض ہے‘ لیکن یہ جِدّوجُہد کرتے ہوئے عبادات سے شغف اور اتباعِ سُنّت کے رنگ کو اپنی شخصیتوں کے اندر پختہ کیا جائے‘ گہرا اتارا جائے۔

مولانا مودودی مرحوم سے اتفاق اور اختلاف

چونکہ فکری اعتبار سے ہمارا سب سے قریبی رشتہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے ساتھ ہے‘ لہٰذا اس حوالے سے ان کا ذکر میری تقریروں اور تحریروں میں بار بار آتا ہے۔ بہت سے لوگ اس پر ناراضگی کا اظہار بھی کرتے ہیں‘ کچھ خیر خواہانہ مشورہ بھی دیتے ہیں کہ آپ نے جو بات کہنی تھی وہ ایک بار کہہ دی‘ بار بار کہنے سے کیا فائدہ؟ آج اپنی گفتگو کو مکمل کرتے ہوئے میں چاہتا ہوں کہ اس ضمن میں بھی کچھ باتیں مثبت طور پر آپ کے سامنے رکھ دوں تاکہ اس پر ہمارا موقف واضح ہو جائے۔

جہاں تک مولانا مودودی کے اساسی فکر کا تعلق ہے اس کو مَیں قریباً صحیح سمجھتا ہوں۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں انہوں نے ’’خلافت و ملوکیت‘‘ نامی جو کتاب لکھی تھی اس سے مجھے شدید اختلاف ہے۔ لیکن ان کے جس فکر پر ۱۹۴۱ء میں جماعت قائم ہوئی تھی اس سے مجھے اگر سو فیصد نہیں تو ۹۰۔۹۵ فیصد اتفاق ضرور ہے۔ اور میرے نزدیک یہ فکر دراصل علّامہ اقبال ہی کے فکر کا تسلسل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں نے بے نظیر کے اس بیان پر شدید گرفت کی تھی کہ ’’ہمیں مودودی کا اسلام نہیں‘ علامہ اقبال کا اسلام چاہیے‘‘۔ میں نے کہا تھا کہ مولانا مودودی اور علامہ اقبال دونوں کا اسلام ایک ہے اور ان دونوں میں تفریق کرنا بڑی عیاری اور مکاری کی بات ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ مولانا مودودی کو حیدر آباد دکن سے لاہور بلانے والے علامہ اقبال ہی تھے۔ مولانا مودودی تو حیدر آباد دکن سے رسالہ نکالتے تھے اور کتابیں شائع کرتے تھے۔ علامہ اقبال نے انہیں حیدر آباد دکن سے لاہور منتقل ہونے کی دعوت دی‘ کیونکہ وہ ۱۹۳۰ء میں یہ خواب دیکھ چکے تھے کہ اس علاقے میں ایک آزاد مسلمان ریاست قائم ہوگی۔ ۱۹۳۰ء کے خطبۂ الٰہ آباد میں ان کے یہ الفاظ موجود ہیں کہ یہ بات نوشتہ تقدیر ہے کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقے میں ایک آزاد مسلمان ریاست قائم ہوگی۔ علامہ اقبال ہی کے ایک عقیدت مند چودھری نیاز علی خان نے انہی کے کہنے پر پٹھان کوٹ میں ادارہ ’’دارالاسلام‘‘ بنایا

اور وہاں آ کر مولانا مودودی نے قیام کیا۔

اگر مولانا مودودی کے اسلام سے اقبال کو اختلاف ہوتا تو کیا وہ مولانا مودودی کو نقل مکانی کے لیے دعوت دے سکتے تھے اور انہیں یہاں پاؤں جمانے کے لیے مدد دے سکتے تھے؟ تو کم سے کم ۱۹۳۸ء تک جب علامہ اقبال کا انتقال ہوا‘ یا ۱۹۳۷ء تک کہہ لیجیے جب علامہ اقبال نے مولانا مودودی کو نقل مکانی کی دعوت دی‘ مولانا مودودی نے جو کچھ لکھا تھا اس کے ساتھ علامہ اقبال کو کامل اتفاق تھا۔ بہرحال میرے نزدیک مولانا مودودی کا فکر دراصل فکر اقبال ہی کی بڑے عمدہ پیرائے اور سلیس انداز سے تشریح و توضیح ہے۔ فکر اقبال کے بارے میں میرے مضامین نوائے وقت میں ’’تفکّر و تذکّر‘‘ کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں‘ جنہیں پھر یکجا کر کے میثاق میں بھی شائع کیا جا چکا ہے[۱]۔ ان میں مَیں نے تفصیل سے لکھا ہے کہ اس صدی میں اسلام کو از سر نو دین کی حیثیت سے پیش کرنا اقبال کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ پھر اس کے لیے عملی جدّوجُہد شروع کرنے کا سہرا ابوالکلام آزاد کے سر ہے۔ یعنی ۱۹۱۲ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک ’’الہلال‘‘ اور ’’البلاغ‘‘ والے ابوالکلام۔ میرے نزدیک یہ تین شخصیتیں اس اعتبار سے بہت نمایاں ہیں: علامہ اقبال‘ مولانا آزاد اور مولانا مودودی۔ فکر میں یہ تینوں تقریباً ایک ہیں‘ انیس بیس کا فرق تو ہوتا ہے۔ اور اس فکر سے مجھے ۹۰۔۹۵ فیصد اتفاق ہے۔

جہاں تک مولانا مودودی کے عملی رویے کا تعلق ہے‘ اس سے مجھے کتنا اتفاق ہے اور کتنا اختلاف ہے‘ یہ مَیں تین درجوں میں واضح کر کے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا مودودی کی زندگی کے جو مختلف ادوار ہیں ان میں ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء تک کے آٹھ سالہ دور سے مجھے ۸۵ فیصد اتفاق ہے‘ ۱۵ فیصد اختلاف ہے۔ مولانا مرحوم نے ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی قائم کی‘ لیکن اس سے قبل ۱۹۳۹ء۔۱۹۴۰ء میں وہ اپنا فکر ’’ترجمان القرآن‘‘ میں پیش کر چکے تھے۔ انہی اصولوں پر انہوں نے جماعت بنائی اور ۱۹۴۷ء تک انہی اصولوں پر چلتے رہے۔ اس سے اکثر و بیشتر مجھے اتفاق ہے۔ صرف تین چیزوں میں معمولی سا اختلاف ہے۔

اوّلاً —— ایمان اور اُس کی باطنی کیفیات پر جتنا زور دیا جانا چاہیے تھا اتنا نہیں دیا‘ اور

(۱) محترم ڈاکٹر صاحبؒ کی کتاب ’’سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں کا ماضی‘ حال اور مستقبل —— اور مسلمانانِ پاکستان کی خصوصی ذمہ داری‘‘ انہی کالموں پر مشتمل ہے۔

تقویٰ اور تدین کی جتنی ناگزیر اور کم از کم ضرورت تھی ان کا اتنا اہتمام بھی نہیں کیا گیا‘ حالانکہ دین میں ان کی اہمیت مسلّم ہے۔ اسلام کا اگر ایک ظاہر ہے تو اس کا ایک باطن بھی ہے۔ نماز کا ظاہر قیام اور رکوع وسجود ہے تو اس کا باطن خشوع وخضوع ہے‘ جو اس کی اصل روح ہے۔ نماز کے ظاہر کا علم فقہ کی کتابوں سے حاصل ہو جاتا ہے‘ لیکن اس کی اصل روحِ باطنی کا علم یا تو صوفیاء کی کتابوں میں ملے گا یا حدیث کی کتابوں میں۔ نماز میں خشوع وخضوع کی یہ کیفیت مطلوب ہے کہ جب سجدے میں سر رکھا جائے تو محسوس یہ ہو کہ اپنے ربّ کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ اگر یہ کیفیت پیدا نہیں ہوئی تو اگرچہ سجدہ تو ہو گیا لیکن وہ بے روح سجدہ ہوا۔ وہ سجدہ نہ ہوا جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے ؎

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اُسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

آج منبر پر کھڑے ہو کر ہاتھ اٹھا اٹھا کر تقریریں کرنے والے بہت ہیں اور محراب میں کھڑے ہو کر بڑی اعلیٰ قراءت کے ساتھ امامت کرنے والے بہت ہیں لیکن یہ منبر ومحراب آج اس سجدے کو ترس گئے ہیں جس سے روحِ زمیں لرز اٹھتی تھی!

ثانیاً —— مولانا مودودی مرحوم نے تحریک پاکستان کی جس شدّت سے مخالفت کی اتنی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مولانا کا یہ فرمانا اپنی جگہ بالکل درست تھا کہ یہ مسلمانوں کی قومی تحریک ہے جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی قومی ریاست تو وجود میں آجائے گی‘ لیکن اس راستے سے اسلام نہیں آئے گا۔ یہ بات تو ڈنکے کی چوٹ کہنی چاہیے تھی‘ لیکن قومی تحریک کی اتنی شدت سے مخالفت کرنا ہرگز مناسب نہیں تھا کہ اسے غیر اسلامی قرار دے دیا جائے‘ کیونکہ مسلمانوں کی آزادی اور ان کے لیے ایک علیحدہ ملک کی جدّوجُہد کوئی بُرا کام نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے بنی اسرائیل جیسی بگڑی ہوئی قوم کو فرعون کی غلامی سے نجات دلوائی۔ لہٰذا مسلمانانِ ہند کے بڑے حصے کے لیے آزادی کی تحریک چلانا کوئی غلط کام نہیں تھا۔ اور مسلمانوں کی دُنیوی فلاح وبہبود اور ان کے سیاسی اور معاشی حقوق کے تحفظ کی کوشش کو غیر اسلامی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ میرے نزدیک اس میں بھی کچھ انتہا پسندی اور زیادتی کا عنصر شامل تھا۔

ثالثاً —— مولانا مودودی مرحوم کا اپنا ذہن اگرچہ یہی تھا (اور مَیں اپنے اس دعوے کو

ثابت کر سکتا ہوں) کہ اقامتِ دین کی جدّوجُہد کرنے والی جماعت بیعت کی بنیاد پر قائم ہونی چاہیے اور اس کے امیر کو وسیع اختیارات حاصل ہونے چاہئیں‘ لیکن بعض اسباب کی بناء پر انہوں نے مغربی جمہوری انداز کا دستور بنا کر ایک دستوری تنظیم بنائی اور پھر ﴿فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ کے مصداق اپنی رائے اور مزاجی ساخت کی بنا پر اس کا حق بھی ادا نہ کر سکے۔ الغرض‘ ان تین امور کو پانچ پانچ فی صد کے حساب سے جمع کر لیجیے تو پندرہ فیصد اختلاف ہے‘ ورنہ میں مولانا مودودی کے ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء کے طریق کار سے ۸۵ فیصد اتفاق کرتا ہوں۔

لیکن تقسیم ہند اور قیامِ پاکستان کے بعد مولانا مودودی نے جو موقف اختیار کیا اور اضافی طور پر جو دو کام کیے ان میں سے ایک کو مَیں صد فی صد صحیح سمجھتا ہوں اور دل میں اک ہوک سی اٹھتی ہے کہ کاش مولانا یہی ایک کام کرتے چلے جاتے اور دوسرا کام نہ کرتے جو صد فی صد غلط تھا۔ قیام پاکستان کے بعد صحیح کام دستورِ اسلامی کا مطالبہ تھا۔ انہوں نے اس کے لیے مہم چلائی کہ آپ نے پاکستان اسلام کے نام پر بنایا ہے‘ اب یہاں دستور بھی اسلامی ہونا چاہیے۔ مولانا مودودی یہ مطالبہ لے کر کھڑے ہوئے تو پوری قوم نے ان کا ساتھ دیا اور ان کی آواز میں آواز ملائی۔ اور چونکہ اُس وقت تک جماعت اسلامی ایک سیاسی پارٹی نہیں تھی لہٰذا مسلم لیگ کے مخلص لوگوں نے بھی اس مطالبے کی حمایت کی۔ یہاں تک کہ ’’قراردادِ مقاصد‘‘ پاس کرانے میں فیصلہ کن کردار مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے ادا کیا۔ انہوں نے دستور ساز اسمبلی میں یہ دھمکی دی تھی کہ اگر تم نے یہ ’’قرارداد پاس‘‘ نہ کی تو مَیں ابھی استعفاء دے کر جاتا ہوں اور عوام کو بتاتا ہوں کہ مسلم لیگ نے اسلام کا نام لے کر دھوکہ دیا تھا۔ اس دھمکی کی بنیاد پر قراردادِ مقاصد پاس ہوئی۔ لیکن وہ جماعت اسلامی کے آدمی تو نہیں تھے‘ وہ مسلم لیگی تھے‘ قائداعظم کے سپاہی تھے۔ اسی طرح عمر حیات ملک جو پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے‘ قائداعظم کے ادنیٰ سپاہی تھے۔ ان لوگوں نے ساتھ دیا کہ یہ اسلام کی بات ہے‘ یہ کسی کے باپ کی جاگیر نہیں ہے‘ اسلام تو ہم سب کی مشترک متاع ہے۔ اور یہ اسی لیے ہوا کہ اُس وقت تک اسلام ایک پارٹی ایشو نہیں بنا تھا۔ اسی راستے پر قدم آگے بڑھنے چاہئیں تھے اور یہی ایک کام جاری رہنا چاہیے تھا۔

قراردادِ مقاصد کی منظوری کے بعد اسلامی دستور کی طرف عوامی دباؤ کے ساتھ قدم بقدم آگے بڑھنا چاہیے تھا‘ اس کے لیے رائے عامہ کو مزید منظم کر کے اس میں تمام طبقات کا تعاون

حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن دوسرے قدم نے بیڑا غرق کر دیا۔ ۱۹۵۱ء کے الیکشن میں حصہ لے کر جماعت اسلامی ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت اختیار کر گئی اور اس طرح اس نے مذہب کو ایک پارٹی ایشو بنا دیا۔ اب جماعت اسلامی کی حیثیت مسلم لیگ کی حریف سیاسی جماعت کی ہو گئی۔ اب ظاہر ہے کہ اس کی ہر بات کو ایک مخالف کی بات سمجھا گیا۔ اب بھلا مسلم لیگی جماعت اسلامی کی بات کی تائید کیسے کرتے؟ اللہ تعالیٰ مولانا مودودی کو معاف فرمائے‘ انہوں نے جو کچھ کیا نیک نیتی سے کیا‘ لیکن میرے نزدیک یہ بہت بڑی غلطی تھی کہ مولانا مودودی ۱۹۵۱ء میں انتخابی میدان میں اُترے اور پنجاب کے الیکشن میں حصہ لیا۔ اس اقدام نے انہیں ایک علیحدہ سیاسی جماعت کی حیثیت سے سیاسی اکھاڑے کا پہلوان بنا کر اسلام کو ایک پارٹی ایشو اور الیکشن ایشو بنا دیا۔ یہ میرے نزدیک اسلام کے مستقبل کے اعتبار سے اس ملک میں بہت بڑی بدقسمتی کا آغاز تھا۔

جماعت اسلامی کے تیسرے دور کا آغاز ۱۹۵۸ء سے ہوتا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں ایوب خان کے مارشل لاء کے بعد مولانا مودودی مرحوم نے جو لائحہ عمل اختیار کیا وہ پچاس فیصد درست تھا اور پچاس فیصد غلط۔ درست یہ کہ مارشل لاء کی مخالفت کی‘ جو آج ہم بھی کر رہے ہیں‘ کیونکہ مارشل لاء اس ملک کے لیے زہر قاتل ہے —— لیکن پچاس فیصد غلطی یہ ہوئی کہ بحالیٔ جمہوریت کے لیے سیکولر قوتوں کے ساتھ مل کر اپنی ساری توانائی اسی کام میں صرف کر دی۔ حالانکہ دیکھنا یہ چاہیے تھا کہ سیکولر جماعتوں کی جدّوجُہد سے جو جمہوریت آئے گی وہ تو سیکولر جمہوریت ہوگی‘ آپ کا اس میں کیا بھلا ہوگا؟ اور اسلام کا اس میں کیا بھلا ہوگا؟ لیکن مولانا مودودی اور جماعت اسلامی نے گیارہ سالہ ایوبی دور (۱۹۵۸ء۔۱۹۶۹ء) میں اپنی تمام مساعی اسی بحالیٔ جمہوریت کی تحریک میں وقف کیے رکھیں۔ اس کا نقصان جماعت کو یہ ہوا کہ اس کی اپنی تنظیمی بنیادیں مستحکم نہیں ہوئیں اور اپنے کارکنوں کی تربیت پر توجہ نہیں دی جا سکی جس کے نتیجے میں وہ اصل قوت فراہم نہیں ہو سکی کہ اپنے بل پر کھڑے ہو کر باطل نظام کو چیلنج کیا جا سکے‘ بلکہ اپنی قوتیں ضائع کر دیں۔ مولانا مودودی مرحوم کی زندگی میں جماعت کے یہ تین دور ہیں۔

جماعت اسلامی کے چوتھے دور کا آغاز وہاں سے ہوتا ہے جب مولانا مودودی نے جماعت کی امارت چھوڑ دی اور میاں طفیل محمد صاحب امیر جماعت بنے۔ یہ چوتھا دور گومگو کا دور ہے۔ اس سے پہلے گیارہ سالہ دور میں جمہوریت کے لیے جہاد کیا گیا تھا اور مارشل لاء کی مخالفت

کی گئی تھی‘ لیکن اس دور میں ضیاء الحق صاحب کے مارشل لاء سے تعاون کیا گیا۔ اس کے بارے میں زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ البتہ اس کے بعد جو دور آیا ہے جس میں قاضی حسین احمد صاحب منظر عام پر آئے ہیں اس کے بارے میں کچھ اظہارِ خیال کرنا چاہتا ہوں۔

قاضی حسین احمد اور ان کی آراء

مَیں نے اس سے پہلے بھی کہا تھا‘ آج پھر کھل کر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ قاضی صاحب جوان ہیں‘ باہمت ہیں‘ ان میں حرکت ہے‘ اس میں کچھ شک نہیں ہے۔ اور جس طرح مَیں نے نواز شریف صاحب کے بارے میں کہا اسی طرح قاضی صاحب کے بارے میں بھی کہہ رہا ہوں کہ وہ اپنی ذاتی حیثیت میں قائد بن کر اُبھرے ہیں (He is a leader in his own right) وہ جماعت اسلامی میں امارت کے منصب پر اپنی ذاتی حیثیت سے فائز ہوئے ہیں۔ وہ مولانا مودودی کے اشارے سے یا کسی اور کے کہنے سے امیر نہیں بنے۔ شروع میں ان کے اندر جوش زیادہ‘ ہوش کم تھا۔ چنانچہ ایک دور میں وہ صدام حسین کی رو میں بھی بہہ گئے تھے اور لال قلعہ دہلی پر پرچم لہرانے کی باتیں بھی برسرِعام کر رہے تھے‘ حالانکہ ایسی باتیں دل میں ہوں تو بھی زبان پر لانے کی نہیں ہوتیں۔ کسی قائد کو ایسی باتیں زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا۔ دل میں ایسی اُمنگ ضرور ہونی چاہیے اور اس کے لیے کوشش بھی کرتے رہنا چاہیے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ((اسْتَعِينُوا عَلَى قَضَاءِ حَوَائِجِكُمْ بِالْكِتْمَانِ)) (السلسلة الصحيحة:۱۴۵۳) یعنی اپنے ارادوں کو مخفی رکھ کر اپنی ضرورتیں پوری کرو۔ یہ نہیں کہ اپنے سارے کارڈ ٹیبل پر رکھ دیں۔ اس سے تو دنیا کو آپ کے خلاف زبان کھولنے کا موقع مل جائے گا۔ اس اعتبار سے ان میں ہوش کی کمی اور جوش کی زیادتی رہی ہے لیکن اب ان میں کچھ سنجیدگی آئی ہے۔

مجھے قاضی حسین احمد صاحب کی تین باتوں سے صدفی صد اتفاق ہے۔ پہلی بات یہ کہ ان کا عالمی حالات کا شعور و ادراک یعنی Global perception صحیح ہے۔ وہ بالکل درست کہہ رہے ہیں کہ اس وقت امریکہ پوری دنیا کی سیاست اور معیشت پر چھا گیا ہے۔ بلکہ مَیں تو اس سے آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ یہ دراصل امریکہ نہیں یہودی ہیں جو دنیا پر چھا چکے ہیں۔ امریکہ تو خود ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہے۔ بائبل کے عہد نامہ جدید کے آخری حصے میں حضرت مسیح علیہ السلام کے حواری یوحنا کے مکاشفات درج ہیں‘ ان میں دنیا کے آخری دور کے حالات کے مکاشفات

میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک بہت بڑا درندہ (beast) ہوگا جس کے سات منہ اور دس بڑے بڑے سینگ ہوں گے اور اس درندے کے اوپر ایک عورت سوار ہوگی۔ اس مکاشفہ میں دجالی فتنے کا تصوّر پیش کیا گیا ہے۔ تو واقعہ یہ ہے کہ آج عیسائی دنیا خاص طور پر ''وائٹ اینگلوسیکسن پروٹیسٹنٹس'' (WASP) اس درندے کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ ان کی درندگی‘ ان کی قوت اور ان کے اسلحے کی ایک ہلکی سی جھلک دنیا خلیج کی جنگ میں دیکھ چکی ہے۔ یہ لوگ ایک چھوٹے سے ملک (عراق) کے خلاف کیسے کیسے دیوہیکل جہاز لے کر آئے تھے‘ حالانکہ ان کے مقابلے میں اس کی کیا حیثیت تھی۔ لیکن یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا کہ وہ چاہتے تھے کہ اس کا اس طور سے بھرکس نکالا جائے کہ ہمارا ایک آدمی بھی نہ مرے‘ ورنہ اگر یہاں سے لاشوں کی بوریاں (deadbody bags) جانا شروع ہوگئیں تو امریکی رائے عامہ قیامت برپا کر دے گی۔ بہرحال اس ''درندے'' کے اوپر اس وقت یہود سوار ہیں‘ جنہیں ان کی بزدلی کی وجہ سے مکاشفہ میں عورت کی شکل میں دکھایا گیا ہے۔

خود قرآن کہتا ہے کہ ان میں جرأت اور ہمت نہیں ہے۔ یہ تو دوسروں کے کھونٹے کے اوپر ناچ رہے ہیں۔ ورنہ اگر امریکہ کہیں ایک دن کے لیے ان کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لے تو آج کا گیا گزرا عرب بھی اسرائیل کی تکا بوٹی کر کے رکھ دے اور ۱۹۷۳ء میں مصریوں نے یہ کر کے دکھایا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں مصریوں کی پیشانی پر جو کلنک کا ٹیکہ لگا تھا وہ انہوں نے ۱۹۷۳ء کی رمضان جنگ میں دھو کر دکھا دیا تھا‘ یہاں تک کہ وہ ''بارلیو لائن'' عبور کر گئے تھے جس کے بارے میں اسرائیل کو وہم و گمان تک نہ تھا کہ کوئی ان کی اس دفاعی لائن کو بھی عبور کر سکتا ہے۔ لیکن جب امریکہ اس کا پشت پناہ بن کر پہنچا تو اس کا مقابلہ کون کرتا! —— تو قاضی صاحب کا یہ فرمانا درست ہے کہ اس وقت امریکہ دنیا پر چھایا ہوا ہے اور یہ بات بھی بلاشبہ درست ہے کہ پاکستان کی تمام سیاسی قوتیں امریکہ کے سامنے سربسجود ہیں‘ خواہ بے نظیر اور اُن کی پیپلز پارٹی ہو اور خواہ نواز شریف اور اُن کے ساتھی ہوں۔

دوسرے یہ کہ اندرونی طور پر ملک کے بارے میں ان کا یہ ادراک درست ہے جس کا وہ برملا اظہار کر رہے ہیں کہ اس ملک سے جب تک سرمایہ داری اور جاگیرداری کا جنازہ نہیں نکلتا حالات بہتر نہیں ہو سکتے۔ جب تک سیاست ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے کوئی مثبت تبدیلی نہیں

آسکتی۔ ان کی یہ بات بالکل درست ہے اگرچہ ان کا عمل اس کے خلاف ہے۔ وہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے جنازہ نکالنے کی بات ۱۹۹۰ء کے انتخابات سے پہلے بھی کر رہے تھے‘ لیکن پھر انہی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ساتھ ''آئی جے آئی'' میں شریک ہو گئے۔ بہرحال ادراک (perception) کی حد تک ان کی یہ بات درست ہے اور اس سے کون اختلاف کی جرأت کرے گا۔ اس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر اے روزِ مکافات!

لیکن اس سرمایہ پرستی اور جاگیرداری کا سفینہ ڈبونے کے لیے تو انقلابی جدّوجُہد کی ضرورت ہے‘ یہ انتخابی عمل سے کیسے ہو جائے گا؟

تیسری بات وہ یہ کہتے ہیں کہ مذہبی جماعتوں کا متحدہ محاذ بنانے کا کوئی فائدہ نہیں‘ ایک قائد کی قیادت میں لوگ جمع ہوں گے تو کوئی پیش رفت ہوگی۔ یہ تو وہی بات ہے جو میں کہتا آرہا ہوں اور جس کی وجہ سے میری مخالفت ہوتی ہے۔ قاضی صاحب نے کہا ہے کہ اب ہم جماعتوں کا اتحاد نہیں بنائیں گے ''اسلامک فرنٹ'' میں لوگ افرادی حیثیت سے آجائیں۔ اس کے لیے وہ دوسری دینی جماعتوں کے کارکنوں کو بھی کھینچنا چاہ رہے ہیں۔ اس ضمن میں میری رائے کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ ''متحدہ شریعت محاذ'' کے تجربے کے بعد تنظیم اسلامی نے یہ پختہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کبھی کسی مذہبی محاذ میں شامل نہیں ہوں گے۔ حدیثِ نبویؐ کی رُو سے مؤمن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔ ہم نے اُس وقت دیکھ لیا تھا کہ متحدہ محاذ میں جتنی بھی جماعتیں شامل ہیں ان کے اندر کوئی جان نہیں ہے اور وہ منظم ہو کر کام کرنے کے لیے تیار بھی نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے دنوں مولانا سمیع الحق صاحب ازراہِ کرم چل کر میرے پاس آئے لیکن میں نے ان سے معذرت کر دی کہ میں کسی ایسے اتحاد میں شرکت نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا کہ آپ انتخابی سیاست سے پسپائی اختیار کر کے آیئے تو ہم آپ کے قدموں میں ہوں گے۔ لیکن آپ یہ انتخابی کھیل بھی کھیلتے رہیں‘ سینٹ میں آپ کی سیٹ بھی پکی رہے اور اس کے لیے آپ کا جوڑ توڑ بھی جاری رہے اور ساتھ کے ساتھ آپ ہمارا تعاون بھی چاہیں تو یہ ناممکن ہے! اس کے بعد پروفیسر ساجد میر صاحب میرے پاس آئے تو میں نے ان سے بھی معذرت کر دی۔

بہر حال قاضی صاحب کی یہ تین باتیں وہ ہیں کہ ’’متفق گردید رائے بوعلی با رائے من‘‘ کے مصداق ان کے بارے میں میری رائے قاضی صاحب کی رائے سے موافقت رکھتی ہے — لیکن میرے نزدیک ان تینوں باتوں کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ آپ انتخابی میدان سے پسپائی اختیار کریں۔ اس ضمن میں بھی تین ہی باتیں مَیں عرض کرنا چاہتا ہوں:

پہلی بات یہ کہ مَیں ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ کوئی سیاسی حکومت امریکہ کے دباؤ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ سیاسی حکومت کو تو ہر وقت اپنے ارکانِ اسمبلی کی خبر گیری کرنا پڑتی ہے کہ کوئی مینڈک پھدک کر اُدھر تو نہیں چلا گیا‘ پھر یہ کہ عوام ساتھ ہیں یا نہیں؟ قربانی دینے کے لیے آمادہ ہوتے ہیں یا نہیں؟ وہ تو انقلابی حکومت ہوتی ہے جو ڈٹ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور عوام بھی اس کے پیچھے مرنے کے لیے تیار ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے بھی موجودہ دور میں ہمارے پاس ایک ہی مثال ہے۔ جہاں تک عقائد اور دوسرے مسائل کا تعلق ہے ان میں مجھے شیعیت سے جو اختلاف ہے وہ سب کو معلوم ہے‘ لیکن انقلابی جِدّ وجُہد کے ضمن میں عہدِ حاضر میں ایک ایران ہی کی مثال میرے سامنے آتی ہے‘ کیونکہ اگر بالفعل کچھ کر کے دکھایا ہے تو ایرانیوں نے کر کے دکھایا ہے۔ امریکہ کے مدِّمقابل بھی اگر کھڑے ہوئے ہیں تو صرف ایرانی کھڑے ہوئے ہیں۔ یا اب سوڈان نے تھوڑی سی ہمت دکھائی ہے اور وہ ایک مثال پیدا کر رہا ہے‘ جو دیکھتے ہیں کب تک کر سکے گا‘ لیکن ایران نے امریکہ اور روس دونوں کو شیطان قرار دے کر اور امریکہ کو ’’شیطان بزرگ‘‘ اور ’’شیطانِ اکبر‘‘ قرار دے کر عظیم مثال قائم کی ہے۔ اور یہ اس لیے ہوا کہ انہوں نے پہلے شاہ کے خلاف ایجی ٹیشن میں ہزاروں جانوں کی قربانی دی۔ اور پھر عراق کے مقابلے میں ان کے لاکھوں بچوں نے گولیاں کھائیں اور جانیں دی ہیں‘ جبکہ پوری مغربی قوت عراق کے پیچھے تھی‘ تمام عرب ممالک عراق کے پشت پناہ تھے‘ لیکن ایرانیوں کا بچہ بچہ مرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جو قوم مرنے کے لیے تیار ہو جائے اسے کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ جذبہ تو پیدا نہ ہوا اور آپ امریکہ کے مقابلے میں کھڑے ہو جائیں‘ یہ ناممکن ہے! یہ جذبہ انقلابی عمل سے پیدا ہوتا ہے‘ آپ انتخابی محاذ بنا کر چاہے کتنے ہی لوگوں کو جمع کر لیں اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔

دوسرے یہ کہ اگر آپ دوسری جماعتوں کے مخلص کارکنوں کو کھینچنا چاہتے ہیں تو وہ آپ

کے ساتھ کیسے آئیں گے‘ جبکہ وہی کام جو آپ کر رہے ہیں وہ خود بھی کر رہے ہیں۔ آپ بھی انتخاب لڑنا چاہتے ہیں اور ان کی جماعتیں بھی انتخاب لڑتی ہیں۔ جمعیت علماء اسلام کا اپنا ایک سیاسی حلقۂ اثر ہے‘ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں ان کے بڑے مضبوط گڑھ ہیں جہاں عوام ان کے ساتھ ہیں‘ تو ان کے کارکن اپنی جماعت کو چھوڑ کر آپ کے پاس کاہے کو آئیں گے؟ ہاں آپ انہیں راستہ دوسرا دکھائیں جس کے لیے لوگوں کے اندر امنگ موجود ہے تو وہ آپ کی طرف کھنچے چلے آئیں گے۔ اس ضمن میں ایک ہوائی سفر کے دوران میری گفتگو ایک صاحب سے ہوئی جن کا تعلق جماعت اسلامی ہی سے ہے اور وہ صوبائی وزیر رہ چکے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ نظری طور پر آپ کی بات صد فی صد درست ہے‘ لیکن یہاں کوئی جان دینے کے لیے میدان میں نہیں آئے گا۔ میں نے کہا کہ آپ بالکل غلط کہہ رہے ہیں‘ قوم میں جان دینے کا جذبہ تو موجود ہے‘ کیا لوگوں نے ختمِ نبوت کے نام پر جانیں نہیں دیں؟ اور انہوں نے دی ہیں جن کا مذہب سے براہِ راست کوئی تعلق بھی نہیں تھا‘ جنہیں آپ گامے ماجھے کہتے ہیں انہوں نے گریبان کھول کھول کر گولیاں کھائی ہیں۔ پھر حال ہی میں سپاہِ صحابہؓ نے اپنے کارکنوں میں کس طرح جانیں دینے کا جذبہ بیدار کیا ہے۔ تو لوگ تو جان دینے کو تیار ہیں‘ انہیں قیادت کی ضرورت ہے۔ اس قوم میں اصل کمی جان دینے والوں کی نہیں ہے‘ بلکہ اصل کمی مستقل اور پیہم کام کرنے والوں کی اور اپنے آپ کو بدلنے والوں کی ہے۔

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

ہمارے عوام کا حال یہ ہے کہ مسجد کی حرمت پر کٹ مریں گے لیکن نماز نہیں پڑھیں گے‘ رسول ﷺ کے نام پر جان دے دیں گے لیکن اتباعِ سُنّت مشکل کام ہے۔ تو میرا اس قوم کے بارے میں جو مشاہدہ ہے وہ بڑا مختلف ہے۔ تاریخ کا کوئی مرحلہ بتا دیجیے جس پر یہ قوم جان دینے میں پیچھے رہ گئی ہو! لیکن اصل کمی وہی ہے جو میں نے ابھی عرض کیا‘ یعنی اپنے آپ کو بدلنا۔ اور اللہ تعالیٰ کی سُنّت یہ ہے کہ ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ ؕ﴾ (الرعد:۱۱)۔

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا!

لہٰذا اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی مرضی کے مطابق بدلو! اپنے وجود پر اللہ کے خلیفہ بنو اور اس پر اللہ کی حکومت قائم کرو! اپنے گھر میں اللہ کے خلیفہ بنو اور وہاں اللہ کا دین نافذ کرو! حکومت الٰہیہ کا چھوٹا سا نقشہ اپنے گھر کے اندر قائم کر کے دکھاؤ اور پھر باطل کو للکارنے کے لیے میدان میں آؤ تو اسی صورت میں تمام دینی حلقوں کے وہ مخلص کارکن آپ کی جانب کھنچ آئیں گے جو انتخابی سیاست سے تو مایوس ہو چکے ہیں لیکن کوئی متبادل صورت موجود نہ ہونے کے باعث چار و ناچار اسی میں لگے ہوئے ہیں۔

تیسری بات یہ کہ اگر آپ الیکشن میں حصّہ لیتے ہیں‘ خواہ آپ جماعت اسلامی کے نام سے الیکشن لڑیں یا اسلامک فرنٹ کے نام سے‘ اس میں آپ کی اجارہ داری (monoply) تو قائم ہونے سے رہی۔ ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں آئی جے آئی کی بھی اجارہ داری تو نہیں تھی۔ اگرچہ اس میں بھی ایسے لوگ شامل تھے جن کے بارے میں بعد میں خود آپ نے کہا کہ انہوں نے مذہب کا نعرہ صرف اپنے سیاسی مقصد کے لیے استعمال کیا۔ آئی جے آئی سے علیحدگی کے وقت آپ کا نواز شریف پر یہی الزام تھا۔ لیکن اُس وقت بعض مذہبی جماعتیں ایسی بھی تھیں جو آئی جے آئی میں شامل نہیں تھیں۔ مثلاً جے یو آئی (فضل الرحمٰن گروپ) اس سے علیحدہ تھی۔ تو جب بھی آپ انتخاب کے میدان میں اتریں گے تو ووٹ تو لازماً تقسیم ہوں گے‘ آپ کی اجارہ داری تو قائم نہیں ہوگی۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ اپنے خطابات میں یہ باتیں کرتے رہتے ہیں‘ لیکن جماعت کی قیادت سے ملاقات کر کے ان سے گفتگو کیوں نہیں کرتے؟ تو مَیں ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ میں نے جماعت اسلامی کے دوسرے لوگوں کے علاوہ اس کے تین چوٹی کے قائدین سے ملاقات کر کے ان سے اس ضمن میں گفتگو کی ہے۔ کراچی میں مَیں نے محمود اعظم فاروقی صاحب سے جو جماعت اسلامی کے سب سے پرانے ایم این اے ہوتے تھے اور پروفیسر عبدالغفور احمد صاحب سے جو اب بھی جماعت کے ایک اہم قائد ہیں‘ ملاقاتیں کیں۔ یہاں پر قاضی حسین احمد صاحب کو خط لکھ کر ان سے ملاقات کا وقت لیا اور پھر ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے بات کی۔ اس ملاقات میں بھی مَیں نے حسنِ اتفاق سے تین ہی نکتے بیان کیے جو مَیں ریکارڈ پر لے آنا چاہتا ہوں۔ مَیں نے ان سے کہا کہ اگر آپ انتخابات کا میدان چھوڑ کر ایک مزاحمتی

تحریک (Resistance Movement) کو منظم کرنے کا بیڑا اٹھا لیں تو آپ کو تین فائدے نقد حاصل ہوں گے:

اوّلاً یہ کہ ہر انتخاب کے بعد ایک بات جو ہمیشہ سامنے آتی ہے یعنی یہ کہ لوگ مذہبی جماعتوں کو گالیاں دیتے ہیں کہ ان کی آپس کی پھوٹ کی وجہ سے ووٹ تقسیم ہوئے اور بیڑا غرق ہوا‘ تو کم از کم آپ تو اس جرم میں شریک نہیں ہوں گے‘ یہ ’’badwill‘‘ آپ کے حصے میں تو نہیں آئے گی‘ لوگوں کا یہ الزام آپ پر تو نہیں آئے گا۔ اور اس طرح آپ جو ’’goodwill‘‘ حاصل کریں گے یہ آئندہ کسی انقلابی جدّوجُہد کے لیے بہت قیمتی سرمایہ ثابت ہوگی۔

ثانیاً یہ کہ جماعت اسلامی انتخابات میں حصّہ لے یا نہ لے‘ یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ اس کا کچھ نہ کچھ ’’ووٹ بینک‘‘ تو ہے‘ لاکھوں کی تعداد میں اس کے ووٹ تو بہر حال ہیں۔ تو تمام مذہبی جماعتیں آپ کی طرف رجوع کریں گی کہ آپ ہمیں ووٹ دیجیے۔ اس طرح آپ کے اور دیگر مذہبی جماعتوں کے مابین کشیدگی کم ہوگی اور بجائے مرکز گریز (centrifugal) رجحان کے‘ مرکز پسند (centripetal) رجحان پیدا ہوگا۔ مزید یہ کہ آپ ان سے اپنی شرائط بھی منوا سکیں گے کہ اگر آپ ہماری یہ شرائط پوری کرتے ہیں تو ہم آپ کو ووٹ دیں گے۔ اس سے اتحاد اور خیر کی طرف پیش قدمی ہوگی۔

ثالثاً یہ کہ جب آپ ’’نہی عن المنکر بالید‘‘ کی روش اختیار کریں گے تو دوسری جماعتوں کے مخلص کارکن بھی آپ کی طرف متوجہ ہوں گے۔ مخلص کارکن ہر جماعت میں موجود ہوتے ہیں۔ غلط پالیسیاں‘ غلط نقطہ نظر یا غلط طرزِ عمل کا معاملہ تو چوٹی کی قیادت کی طرف سے ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر جماعت کے مخلص کارکن آپ کی طرف آئیں گے۔ مجھے اس کا تجربہ ہوا تھا جب ۱۹۸۲ء میں مَیں نے خواتین کے پردے سے متعلق اسلامی احکام کو برملا بیان کیا اور اس کے جواب میں مغربی تہذیب کی دلدادہ خواتین کی طرف سے میری مخالفت ہوئی تو دیوبندی‘ بریلوی اور اہلحدیث تمام مکاتیبِ فکر کی مساجد سے میری بھرپور تائید ہوئی تھی۔ جماعت اسلامی کے اُس وقت کے امیر میاں طفیل محمد صاحب نے حیدر آباد کے جلسہ عام میں میری تائید میں فرمایا کہ یہ بات بالکل درست ہے۔ گورنر سندھ کی بیوی کی قیادت میں مٹھی بھر خواتین نے کراچی ٹی وی سٹیشن کے باہر میرے خلاف مظاہرہ کیا تو اس کے جواب میں جماعت اسلامی حلقہ خواتین کی طرف سے میری حمایت

میں بھرپور مظاہرہ کیا گیا جس میں بڑی تعداد میں باپردہ خواتین نے شرکت کی۔ تو آپ اس نہج پر کام کریں گے تو آپ کو اس قوم کے اندر سے مدد ملے گی‘ تعاون ملے گا‘ رفاقت میسّر آئے گی۔

لیکن —— افسوس صد افسوس کہ ان کا پرنالہ اب بھی انتخابی عمل کی طرف ہی بہہ رہا ہے۔ بہرحال مَیں یہ باتیں کہتا ہوں‘ کہتا رہا ہوں اور کہتا رہوں گا ؎

اِک طرزِ تغافل ہے سو وہ اُن کو مبارک
اِک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے!

لیکن یہ حقِ نصیحت ہے‘ حقِ خیرخواہی ہے جو ہمیں اپنا دینی فریضہ سمجھ کر ادا کرنا ہے۔ یہ نہ تو ان کی بدخواہی ہے اور نہ ہی مخالفت ہے۔ مَیں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آخری وقت تک حق کہنے کی توفیق دیتا رہے۔ باقی یہ کہ لوگوں کا رجوع ہو یا نہ ہو‘ یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ ہم کس کھیت کی مولی ہیں‘ دنیا میں کتنے ہی انبیاء ایسے گزر گئے کہ ان کی دعوت کی طرف لوگوں کا کوئی رجوع نہیں ہوا۔ لیکن ان کے لیے یہ نہ تو ناکامی کا مقام تھا اور نہ تشویش کا۔ وہ اس دنیا سے کامیاب و کامران گئے ہیں‘ کیونکہ ان پر جو ذمہ داری تھی وہ انہوں نے ادا کر دی۔ انبیاء کی سُنّت یہی ہے کہ حق کی بات آخری وقت تک اور آخری سانس تک کہتے رہیے۔ اگر کوئی قبول کرے گا تو اپنے بھلے کو‘ اور جو اسے رد کرے گا یا اس کی مخالفت کرے گا تو وہ اس کا اللہ کے حضور جواب دہ ہوگا۔ اگر کوئی آپ کی نیت پر حملہ کرے گا تو اس کی جواب دہی بھی اُسی کے ذمے ہوگی‘ اس کے پلے میں اگر کوئی بھلائی یا نیکی ہے تو وہ آپ کو مل جائے گی اور آپ کے اعمال نامے میں اگر کوئی برے اعمال ہیں تو انہیں وہ اپنے اعمال نامے میں درج کروا لے گا۔ اس طرح ہمارے لیے تو ہر حال میں نفع ہی نفع ہے‘ نقصان کا کوئی معاملہ ہے ہی نہیں —— لیکن اپنی بات مَیں نے آج اس لیے واضح طور پر بیان کر دی کہ ہمارا صحیح صحیح موقف سب کے سامنے آ جائے اور سورۃ الانفال کے الفاظ ﴿لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۭ﴾ کے مصداق اس کے بعد جسے ہم سے اختلاف کرنا ہو وہ علیٰ وجہ البصیرت کرے‘ اور تعین کے ساتھ کرے کہ آپ کی فلاں بات غلط ہے‘ لہٰذا ہم اسے نہیں مانتے۔ اس کے برعکس مبہم سا اختلاف اور مبہم انداز میں نیتوں پر حملے کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے!!

اَقُوْلُ قَوْلِی ھٰذَا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات OO

اقسامِ وحی اور قرآن حکیم (۲)

پروفیسر حافظ قاسم رضوان

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ بالا حدیث میں بیان کردہ وحی کے دو طریقوں کے علاوہ دوسری احادیث صحیحہ سے نزولِ وحی کے درج ذیل دیگر اہم طریقے بھی ثابت ہیں:

(۳) فرشتے کا اصلی شکل میں آنا: وحی کی تیسری صورت میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کسی انسان کی شکل اختیار کیے بغیر اپنی اصلی صورت میں دکھائی دیتے تھے۔ لیکن ایسا حضور ﷺ کی زندگی میں صحیح سند کے مطابق صرف دو مرتبہ ہوا ہے' ایک مرتبہ اس وقت جب آپ ﷺ نے خود حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصلی شکل میں دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی' دوسری مرتبہ معراج کے موقع پر۔

(۴) رؤیائے صادقہ: وحی کی چوتھی صورت یوں تھی کہ آپ ﷺ کو نزولِ قرآن سے قبل سچے خواب آیا کرتے تھے' جو کچھ آپ خواب میں دیکھتے بیداری میں ویسا ہی ہوجاتا۔ صحیح البخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

اَوَّلُ مَا بُدِیَ بِہٖ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مِنَ الْوَحیِ الرُّؤْیَا الصَّالِحَۃُ فِی النَّوْمِ'
فَکَانَ لَا یَرٰی رُؤْیَا اِلَّا جَاءَت مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ

''رسول اللہ ﷺ پر وحی کی ابتدا نیند کی حالت میں سچے خوابوں سے ہوئی' اس وقت آپؐ جو خواب بھی دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح سچا نکلتا۔''

ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں ایک منافق نے حضور ﷺ پر سحر (جادو) کر دیا تھا۔ اس کی اطلاع اور اس کا دفعیہ (دور کرنے کا طریقہ) بھی آپؐ کو خواب میں ہی بتایا گیا۔

(۵) کلامِ الٰہی: وحی کی اس صورت میں حضور ﷺ کو بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح اللہ تعالیٰ سے براہِ راست ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ بیداری کی حالت میں یہ واقعہ صرف معراج کے موقع پر پیش آیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک مرتبہ خواب میں بھی آپؐ اللہ تعالیٰ سے

ہم کلام ہوئے ہیں۔ (الاتقان)

(۶) نفث فی الروع: وحی کی چھٹی صورت یہ تھی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کسی بھی شکل میں سامنے آئے بغیر حضور ﷺ کے قلب مبارک میں کوئی بات القاء فرما دیتے تھے۔ ''الاتقان'' کی ایک اور روایت میں حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے: ((اِنَّ رُوحَ الْقُدُس نَفَثَ فِی رَوعِی)) ''روح القدس (حضرت جبرئیلؑ) نے میرے دل میں یہ بات ڈالی''۔ مستدرک حاکم کی روایت میں آپ ﷺ کے یہ الفاظ ہیں: ((اِنَّ جِبْرِیْلَ عَلَیْہِ السَّلام اَلْقٰی فِیْ رَوْعِی اِنَّ احدًا مِنْکُمْ لَنْ یَخْرُجَ مِنَ الدُّنْیَا حَتّٰی یَتَکَمَّلَ رِزْقَہٗ)) ''بے شک جبرئیل علیہ السلام نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ تم میں سے کوئی بھی دنیا سے نہیں جائے گا' تاوقتیکہ وہ اپنا رزق پورا نہ کرلے۔''

وحی اور کشف والہام

وحی صرف انبیائے کرام علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے اور کسی بھی غیر نبی کو' خواہ وہ تقدس اور ولایت کے جتنے بھی بلند مقام پر ہو' وحی نہیں آسکتی۔ البتہ بعض اوقات باری تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو کچھ باتیں بتا دیتا ہے' اسے کشف یا الہام کہا جاتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے کشف اور الہام میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ کشف کا تعلق حسیات سے ہے' یعنی اس میں کوئی چیز یا واقعہ آنکھوں سے نظر آجاتا ہے' اور الہام کا تعلق وجدانیات سے ہے' یعنی اس میں کوئی چیز نظر نہیں آتی صرف دل میں کوئی بات ڈال دی جاتی ہے' اسی لیے عموماً کشف کی نسبت الہام زیادہ صحیح ہوتا ہے۔ وحی کی آخری صورت ''نفث فی الروع'' بظاہر الہام سے بہت قریب ہے' کیونکہ دونوں کی حقیقت یہی ہے کہ دل میں کسی بات کا القاء کر دیا جاتا ہے' البتہ دونوں میں حقیقت کے اعتبار سے یہ فرق ہے کہ وحی میں (جو صرف نبی کو ہوتی ہے) ساتھ ساتھ یہ علم بھی ہوجاتا ہے کہ یہ بات کس نے دل میں ڈالی ہے۔ چنانچہ مستدرک حاکم کی مذکورہ بالا روایت میں آنحضرت ﷺ نے صراحتاً بتلا دیا کہ روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے' لیکن الہام ڈالنے والے کی تعیین نہیں ہوتی' بس یہ محسوس ہوتا ہے کہ دل میں کوئی بات آگئی جو پہلے نہیں تھی (علامہ رشید رضا)۔ اسی بنا پر انبیائے کرام علیہم السلام کی وحی سو فیصد یقینی ہوتی ہے اور اس کی پیروی فرض ہے' لیکن اولیائے کرام کا الہام یقینی نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی پیروی فرض ہے۔ بلکہ اگر کشف' الہام یا

خواب کے ذریعے کوئی ایسی بات علم میں آئے جو قرآن وسُنّت کے معروف احکام کے مطابق نہ ہو تو اس پر یا اس کے تقاضے پر عمل کرنا کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں۔ (علامہ شاطبی)

وحی متلو اور غیر متلو

حضورِ اقدس ﷺ پر دو قسم کی وحی نازل ہوئی ہے‘ ایک تو قرآن پاک کی آیات جن کے الفاظ اور معنی دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھے‘ اور جو قرآن کریم میں اس طرح محفوظ کر دی گئیں کہ ان کا ایک نقطہ یا شوشہ بھی نہ بدلا جا سکا ہے اور نہ ہی بدلا جا سکتا ہے۔ اس وحی کو علماء کی اصطلاح میں ’وحی متلو‘ کہا جاتا ہے‘ یعنی وہ وحی جس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ دوسری وہ ہے جو قرآن مجید کا حصّہ نہیں بنی لیکن اس کے ذریعے آپ ﷺ کو بہت سے احکامات عطا کیے گئے ہیں‘ اس کو اصطلاح میں ’وحی غیر متلو‘ کہا جاتا ہے‘ یعنی وہ وحی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی۔ عموماً وحی متلو یعنی کلام اللہ میں دین اسلام کے اصولی عقائد اور بنیادی تعلیمات کی تشریح پر اکتفا کیا گیا ہے‘ ان تعلیمات کی تفصیل اور جزوی مسائل زیادہ تر وحی غیر متلو کے ذریعے بتائے گئے ہیں۔ وحی غیر متلو مستند احادیث کی شکل میں محفوظ ہے‘ اس میں عموماً صرف مضامین وحی کے ذریعے حضور ﷺ پر نازل کیے گئے ہیں اور ان مضامین کی تعبیر کے لیے الفاظ کا انتخاب آپ ﷺ نے خود فرمایا ہے۔ (الاتقان)

وحی کی ان دو اقسام کے لیے بالترتیب وحیِ جلی اور وحیِ خفی کے الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں۔

ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: ((أُوْتِيْتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ)) ’’مجھے قرآن بھی دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس جیسی دوسری تعلیمات بھی‘‘۔ اس میں قرآن عزیز کے ساتھ جن دوسری تعلیمات کا ذکر ہے‘ اس سے مراد یہی وحی غیر متلو ہے۔ اسلامی احکامات کی جزوی تفصیلات چونکہ اسی وحی غیر متلو کے ذریعے بتائی گئی ہیں‘ اس لیے جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہنے کے باوجود اسلامی احکام کی پابندیوں سے آزاد زندگی گزارنا چاہتے ہیں انہوں نے یہ شوشا چھوڑ رکھا ہے کہ وحی غیر متلو کوئی چیز نہیں‘ آنحضرت ﷺ پر جتنی وحی اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے وہ سب قرآن حکیم میں محفوظ ہے‘ اس کے علاوہ جو احکام آپ ﷺ نے دیے ہیں وہ ’’مرکزِ ملّت‘‘ یا سربراہِ مملکت و ریاست کی حیثیت سے دیے‘ جو صرف اس

زمانے کے مسلمانوں کے لیے واجب العمل تھے‘ آج ان پر عمل کرنا لازم نہیں۔ لیکن یہ تصوّر بالکل غلط اور باطل ہے۔ خود قرآن مجید کی متعدد آیات سے پتا چلتا ہے کہ وحی الٰہی صرف کلام اللہ میں ہی منحصر نہیں‘ بلکہ آیاتِ قرآنی کے علاوہ بھی حضور ﷺ کو بہت سی باتیں بذریعہ وحی بتائی گئی تھیں۔ اس دعویٰ کی تائید میں درج ذیل قرآنی دلائل پر غور کریں:

(ا) سورۃ البقرۃ میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ۭ﴾ (آیت ۱۴۳)

’’اور جس قبلہ کی طرف آپ پہلے (رخ کرتے) تھے‘ اسے ہم نے صرف اس لیے مقرر کیا تھا تاکہ ہم یہ جان لیں (ظاہر کر دیں) کہ کون رسول کی اتباع کرتا ہے اور کون اپنی ایڑیوں کے بل پلٹ جاتا ہے۔‘‘

ہر مسلمان جانتا ہے کہ آنحضرت ﷺ مدینہ طیبہ میں ایک عرصہ تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے ہیں۔ اس کے بعد جب دوبارہ بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا حکم ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم (باری تعالیٰ) نے بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم صرف اس لیے دیا تھا کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ کون اس حکم کی تعمیل کرتا ہے اور کون اس سے انکار۔ یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس آیت میں بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کے حکم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب منسوب فرمایا ہے۔ آپ قرآن کریم کو سورۃ الحمد سے لے کر سورۃ الناس تک پڑھ جائیں‘ اس میں کہیں یہ حکم آپ کو نہیں ملے گا کہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھو۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ نے کسی ایسی وحی کے ذریعے دیا تھا جو قرآن کریم میں کہیں مذکور نہیں ہے اور اسی کا نام ’وحی غیر متلو‘ ہے۔

(ب) سورۃ التحریم میں فرمایا گیا:

﴿وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ۭ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ③﴾

’’اور جب نبی (ﷺ) نے اپنی بعض بیویوں سے ایک پوشیدہ بات کہی‘ پس جب اس

(بیوی) نے اس بات کی خبر (دوسری کو) کر دی اور اللہ نے اپنے نبی کو اس پر آگاہ کر دیا تو انہوں نے تھوڑی سی بات تو بتادی اور تھوڑی سی ٹال گئے۔ پھر جب نبی نے اپنی اس بیوی کو یہ بات بتلائی تو وہ کہنے لگی کہ اس کی خبر آپ کو کس نے دی؟ فرمایا کہ سب کچھ جاننے والے، پوری خبر رکھنے والے (اللہ) نے مجھے یہ بتلایا ہے۔''

اس آیت کی مختصر تشریح یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ایک زوجہ محترمہ نے ایک بات آپ ؐ سے چھپانی چاہی تھی، اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی وہ بات حضور ﷺ کو بتلا دی۔ اس پر انہوں نے آپ ؐ سے پوچھا کہ یہ بات آپ کو کس نے بتائی؟ حضور ﷺ نے جواب دیا کہ اس بات کی خبر مجھے علیم وخبیر ہستی یعنی اللہ تعالیٰ نے دی۔ اب اس آیت میں یہ تصریح ہے کہ وہ پوشیدہ بات ربِّ کائنات نے آپ کو بذریعہ وحی بتلائی تھی، حالانکہ پورے قرآن کریم میں اس بات کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اطلاع حضور ﷺ کو وحی غیر متلو کے ذریعے دی گئی تھی۔ اور بھی متعدد آیات سے وحی غیر متلو کا ثبوت ملتا ہے، یہاں اختصار کے پیش نظر صرف انہی دو آیات پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اگر تحقیق حق مقصود ہو تو یہ دو آیات بھی اس بات کا ناقابلِ انکار ثبوت مہیا کرنے کے لیے کافی ہیں کہ وحی غیر متلو بھی وحی کی ایک قسم ہے اور وہ بھی وحی متلو کی طرح بالکل یقینی اور واجب الاتباع ہے۔

کیا قرآن کے صرف معانی وحی ہیں؟

پیچھے ذکر ہو چکا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں: ایک وحی متلو یعنی قرآن مجید، اور دوسری وحی غیر متلو۔ اس دوسری قسم میں عموماً یہ ہوا ہے کہ صرف مضامین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے تھے اور انہیں تعبیر کرنے کے لیے الفاظ کا انتخاب حضرت جبرئیل ؑ یا حضور اقدس ﷺ فرماتے تھے، لیکن قرآن عظیم کا معاملہ یہ نہیں ہے، وہ لفظاً اور معناً پورے کا پورا اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ جس طرح اس کے مضامین خدائے بزرگ و برتر کی جانب سے ہیں اسی طرح اس کے الفاظ بھی مِن وعَن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں، ان کے انتخاب یا ترکیب و انشاء میں نہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا کوئی دخل ہے اور نہ ہی حضورِ اقدس ﷺ کا۔

جو لوگ وحی کے بارے میں مادہ پرستوں کے اعتراضات سے مرعوب ہیں، ان میں سے بعض کا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن کا صرف مفہوم بذریعہ وحی نازل ہوا تھا اور (معاذ اللہ!) اس کے

الفاظ اور تراکیب وغیرہ سب حضرت جبریل یا آنحضرت ﷺ کی ہیں، لیکن یہ خیال مکمل طور پر باطل، مہمل اور قرآن وسنّت کے صریح دلائل کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ اس کے الفاظ اور معانی دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں۔ اس حوالے سے چند دلائل درج ذیل ہیں:

(ا) قرآن عظیم نے جا بجا اپنی ایک صفت 'عربی' بیان کی ہے یعنی کہ اسے عربی میں نازل کیا گیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر قرآن مجید کا صرف مفہوم وحی کے ذریعے نازل ہوا ہوتا تو پھر سورۃ الزخرف کی اس آیت کے کوئی معنی ہی نہیں بنتے: ﴿اِنَّا جَعَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ۝۳﴾ ''بے شک ہم نے اس کو عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تاکہ تم سمجھ لو''۔ اور نہ ہی سورۂ یوسف کی اس آیت کا مفہوم سمجھ میں آتا: ﴿اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ۝۲﴾ ''یقیناً ہم نے اس کو قرآن عربی (بنا کر) نازل کیا ہے کہ تم سمجھ سکو''۔ اس لیے کہ عربیت الفاظ کی صفت ہے، نہ کہ معانی کی۔

(ب) قرآن مجید میں کئی جگہ حضورِ اقدس ﷺ کے درج ذیل فرائضِ منصبی بیان کیے گئے ہیں، جیسے کہ سورۂ آل عمران میں ارشادِ خداوندی ہے:

﴿لَقَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذۡ بَعَثَ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ ۚ﴾ (آیت ۱۶۴)

''بے شک اہلِ ایمان پر اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ انہی میں سے ایک رسول ان میں بھیجا جو انہیں اس (اللہ) کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے ذمے دو فرائض الگ الگ تھے، ایک آیاتُ اللہ کی تلاوت اور دوسرے ان کی تعلیم۔ اب ظاہر ہے کہ تلاوت الفاظ کی ہوتی ہے معانی کی نہیں۔ لہٰذا حضور ﷺ کے سب سے پہلے فریضہ منصبی کا تعلق صرف الفاظِ قرآن سے ہے، ان کے معانی سے نہیں۔

(ج) قرآن عظیم نے جا بجا اپنے لیے 'الکتٰب' کا لفظ استعمال کیا ہے اور لفظ 'کتاب' کا اطلاق صرف ذہنی مضامین کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ جب ان مضامین کو الفاظ کے سانچے میں ڈھال لیا جائے تب اسے 'کتاب' کہا جاتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ

قرآن کریم کے الفاظ اور معانی دونوں منزل من اللہ ہیں۔

(د) سورۃ القیامہ کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ جب حضرت جبرئیلؑ وحی لے کر آتے تو نبی کریم ﷺ اسے یاد کرنے کے لیے جلدی جلدی الفاظ دہراتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝۱۶ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝۱۷ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝۱۸ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝۱۹﴾

"(اے نبی ﷺ!) آپ قرآن کو جلدی (یاد کرنے) کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں۔ اس کا جمع کرنا اور (آپ کی زبان سے) پڑھوانا ہمارے ذمے ہے۔ ہم جب (فرشتے کی زبانی) اسے پڑھ لیں تو آپ اس کے پڑھنے کی پیروی کریں۔ پھر اس کا واضح کر دینا ہمارے ذمہ ہے۔"

یہ آیت ربانی صراحتاً اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام جو الفاظ قرآنی لے کر آتے تھے وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہوتا تھا۔ اسی لیے اس کے الفاظ یاد کرانے، اس کی تلاوت کا طریقہ سکھانے اور اس کے معانی کی تشریح کرنے کے تینوں کام اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لیے ہیں۔ ان واضح دلائل کی روشنی میں یہ گمان بالکل باطل ثابت ہوتا ہے کہ الفاظِ قرآنی وحی کے ذریعے نازل نہیں کیے گئے۔ اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے شیخ محمد عبدالعظیم زرقانی نے "مناہل القرآن" میں بڑی عمدہ بات لکھی ہے کہ "اس مقام پر بحث کا لُبِّ لُباب یہ ہے کہ قرآن کریم کے تو الفاظ اور معنی دونوں بالاتفاق وحی کے ذریعے نازل ہوئے ہیں، اور احادیثِ قدسیہ کے بارے میں مشہور قول یہی ہے کہ ان کے الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، البتہ احادیثِ نبویہ کے صرف معنی وحی ہیں، الفاظ حضور ﷺ کے اپنے ہیں، اور جو احادیث آپؐ نے اپنے اجتہاد سے ارشاد فرمائیں ان کے الفاظ اور معنیٰ دونوں حضور ﷺ کے ہیں۔"

دراصل جن لوگوں نے الفاظ قرآن کے وحی ہونے سے انکار کیا ہے، ان کے اس مغالطے کا منشا یہی ہے کہ وحی کے ذریعے الفاظ کا نزول ان کی سمجھ میں نہ آ سکا۔ لیکن وحی کی حقیقت اور اس کی عقلی ضرورت کو مدِّنظر رکھا جائے تو یہ شبہ خودبخود دور ہو جاتا ہے۔ اگر وحی واقعتاً ایک ضرورت ہے اور باری تعالیٰ اس پر قادر ہے، تو آخر کون سی معقول وجہ ہے کہ وہ ذاتِ برحق معنی تو نبی کے قلب پر اُتار سکے اور الفاظ اُتارنے پر (معاذ اللہ) قادر نہ ہو؟ یہاں یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ

علامہ بدرالدین زرکشیؒ نے "البرہان" اور علامہ سیوطیؒ نے "الاتقان" میں بعض لوگوں کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک کلام اللہ کے صرف مضامین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور الفاظ حضرت جبرئیلؑ کے ہیں یا حضور ﷺ کے، لیکن قرآن وسنّت اور اجماعِ اُمّت کے مضبوط دلائل کی روشنی میں یہ اقوال بالکل باطل ہیں۔ اُمّتِ مُسلمہ کا اجتماعی عقیدہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ، معانی اور مفہوم سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ مذکورہ بزرگوں نے بھی ان اقوال کے قائلین کا کوئی حوالہ نہیں دیا، بلکہ قَالَ بَعْضُهُمْ (بعض لوگوں نے کہا ہے) کہہ کر یہ اقوال نقل کر دیے ہیں۔ علامہ سیوطی نے تو اس کی صراحتاً تردید بھی کی ہے، اس لیے ان اقوال کو قطعاً اس مذہب باطل کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ احقر نے خود ڈاکٹر اسرار احمدؒ صاحب کی زبانی سنا ہے جو لاہور میں ہی غالباً ایف سی کالج کے انگریز پرنسپل اور علامہ اقبال کے درمیان پیش آیا۔ وہ دونوں کسی دعوت میں اکٹھے تھے کہ پرنسپل صاحب نے حضرت علامہ سے کہا کہ مَیں نے سنا ہے کہ آپ بھی verbal revelation (وحی بالالفاظ) کے قائل ہیں۔ اس پر علامہ اقبال کا جواب ان کی ذہانت پر دلالت کرتا ہے۔ آپ نے کہا کہ جی ہاں، مَیں verbal revelation کو نہ صرف مانتا ہوں، بلکہ مجھے تو اس کا ذاتی تجربہ بھی ہے۔ خود مجھ پر جب شعر نازل ہوتے ہیں تو وہ الفاظ میں ڈھلے ہوتے ہیں، میں کوئی لفظ بدلنا چاہوں تو بھی نہیں بدل سکتا، گویا وہ میری تخلیق نہیں بلکہ مجھ پر نازل کیے جاتے ہیں۔ علامہ کے اس جواب کا مطلب یہ تھا کہ جب مجھ پر اشعار الفاظ کی شکل میں نازل ہوتے ہیں تو پھر حضور ﷺ پر وحی الفاظ کی شکل میں کیوں نہیں آ سکتی اور اس کے تسلیم کرنے میں کیا امر مانع ہے؟

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر "بیان القرآن" کے ترجمہ وترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں، آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

شرک کا گناہ

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے اور اس کمزوری کے تحت اس سے گناہوں کا صدور ہو جاتا ہے۔ خالق نے انسان کی اس کمزوری کا اُسے بھرپور فائدہ دیا ہے۔ انسان دنیا کی زینت میں کھو کر یا فوری فوائد دیکھ کر کوئی گناہ کر بیٹھتا ہے۔ پھر جب وہ اس گناہ پر پشیمان ہو کر توبہ کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ نہ صرف اس کا گناہ معاف کر دیتا ہے بلکہ اس بندے سے راضی ہو جاتا ہے۔ جب بندہ کسی گناہ کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو مہلت دیتا ہے۔ اگر وہ اپنا ارادہ پورا نہیں کرتا تو اس کو ایک نیکی عطا کر دی جاتی ہے' اور اگر وہ اپنا ارادہ پورا کر کے گناہ کا وہ کام کر لیتا ہے تو وہی ایک گناہ اُس کے نامہ عمال میں لکھا جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ کوئی نیکی کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس ارادے پر ہی اُسے ایک نیکی کا اجر دیا جاتا ہے' اور اگر وہ اپنے ارادے کے مطابق نیکی کر گزرتا ہے تو اسے دس نیکیوں کا ثواب دیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ہے' اسے اپنے بندوں کو معاف کرنا پسند ہے۔ اس کا فرمان ہے: ﴿وَمَآ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ وَيَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ ﴿۳۰﴾﴾ (الشوریٰ) ''اور جو مصیبت بھی تم پر واقع ہوتی ہے وہ تمہارے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہوتی ہے' اور بہت سے گناہ تو وہ معاف بھی کرتا رہتا ہے۔'' یعنی انسان اپنے گناہوں کی وجہ سے بہت سی مصیبتوں کا شکار بنتا ہے مگر اللہ تعالیٰ اس سے بہت سی مصیبتیں ویسے ہی ٹال دیتا ہے۔ اسی طرح اس نے وعدہ کر رکھا ہے کہ اگر کوئی شخص بڑے بڑے گناہوں سے بچے گا تو اُس کے چھوٹے چھوٹے گناہ خود ہی بخش دیے جائیں گے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا كَبَآئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نُكَفِّرۡ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ وَنُدۡخِلۡكُمۡ مُّدۡخَلًا كَرِيۡمًا ﴿۳۱﴾﴾ (النساء) ''اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے جن سے تم کو منع کیا جاتا ہے اجتناب رکھو گے تو ہم تمہاری چھوٹی برائیوں کو تم سے دُور کر دیں گے اور تمہیں عزّت کی جگہ پر داخل کریں گے۔'' یعنی انسان اگر بڑے بڑے

گناہوں مثلاً سود' قتل' بدکاری' وعدہ خلافی' جھوٹ' غیبت' فحاشی وغیرہ سے بچ کر زندگی گزارے تو اس کے چھوٹے چھوٹے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ مائل بہ کرم ہے' وہ نیکی کرنے والے کو کم از کم دس گنا اجر دیتا ہے' مگر گناہ گار کو اس کے گناہ کی مقدار ہی میں سزا ملے گی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِهَا ۚ وَمَنۡ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجۡزٰٓى اِلَّا مِثۡلَهَا وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ﴿۱۶۰﴾﴾ (الانعام) ''جو کوئی (اللہ کے حضور) نیکی لے کر آئے گا اس کو ویسی دس نیکیاں ملیں گی' اور جو برائی لائے گا اسے ویسی ہی سزا ملے گی اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔'' یہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر خاص مہربانی ہے کہ نیکیوں کو تو وہ پروان چڑھاتا ہے اور کئی گنا بڑھاتا ہے مگر اکثر گناہوں کو تو معاف ہی کر دیتا ہے یا گناہ کو ایک ہی لکھا جاتا ہے۔ بخاری اور مسلم کی متفق علیہ حدیث ہے' حضرت عبداللہ بن عباس ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو نیکیاں اور برائیاں لکھنے کا حکم دیا' اس طرح پر کہ جو شخص نیکی کا ارادہ کرے اور اس پر عمل نہ کر سکے تو اللہ تعالیٰ اس کو ایک پوری نیکی شمار کر لیتا ہے' اور جو شخص نیکی کا ارادہ کر کے اس پر عمل کرے اس کے حساب میں ایک نیکی کے بدلہ میں دس نیکیوں سے سات سو نیکیوں تک بلکہ اس سے بھی زیادہ لکھی جاتی ہیں' اور جو شخص برائی کا ارادہ کرے اور بُرائی کو عمل میں نہ لا سکے تو اللہ تعالیٰ اپنے ہاں اس کے حساب میں ایک پوری نیکی لکھ لیتا ہے' اور جو شخص بُرائی کا ارادہ کر کے اس کو عمل میں بھی لائے تو صرف ایک برائی اس کے نامہ اعمال میں لکھی جاتی ہے۔''

اللہ تعالیٰ جس طرح اپنی ذات میں بے مثل اور بے مثال ہے اسی طرح اس کی ہر صفت بھی لامحدود اور بے کنار ہے۔ اور اس کی صفتِ رحمت تو سب سے بڑھ کر ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَرَحۡمَتِىۡ وَسِعَتۡ كُلَّ شَىۡءٍ ؕ﴾ (الاعراف:۱۵۶) ''اور میری رحمت چھائی ہوئی ہے ہر شے پر''۔ گناہ کو چھوڑ کر سچے دل سے توبہ کرنے والے تو ایسے ہیں کہ فرشتے بھی اُن کے لیے بخشش کی دعا کرتے ہیں۔ ارشاد ہے: ﴿رَبَّنَا وَسِعۡتَ كُلَّ شَىۡءٍ رَّحۡمَةً وَّعِلۡمًا فَاغۡفِرۡ لِلَّذِيۡنَ تَابُوۡا﴾ (المؤمن:۷) ''اے ہمارے پروردگار! تیری رحمت ہر چیز پر پھیلی ہوئی ہے' پس تُو بخش دے ان لوگوں کو جو توبہ کریں۔'' اللہ تعالیٰ کو بندے کا گناہوں کو چھوڑ کر سچے دل سے توبہ کرنا اس قدر پسند ہے کہ ایسے شخص کے گناہوں کو وہ نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔ سورۃ

الفرقان میں کبیرہ گناہوں کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوا: ﴿اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمۡ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۷۰﴾﴾ ''مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے کام کیے تو ایسے لوگوں کے گناہوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں میں بدل دے گا۔ اور اللہ تو بخشنے والا مہربان ہے۔'' گویا سالہا سال تک گناہوں میں لتھڑا ہوا انسان بھی اگر گناہوں کو چھوڑ کر سچے دل سے تائب ہو جائے تو اس کے گناہوں کو قلم زد کر دیا جاتا ہے' بلکہ اللہ تعالیٰ کی بے حساب رحمت اس کے گناہوں کو نیکیوں میں بدل دیتی ہے۔

قرآن وحدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی خطاؤں سے درگزر کرتا رہتا ہے۔ ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ اگر بندے سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے اور وہ گناہ کے بعد نیکی کرے تو وہ نیکی اس گناہ کو مٹا دے گی۔ حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہمارا پروردگار رات کے آخری تہائی حصے میں آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے اور کہتا ہے: کون ہے جو مجھ سے مانگے تاکہ میں اس کے سوال کو پورا کروں؟ کون ہے جو مجھ سے مغفرت چاہے اور میں اُس کو بخش دوں؟'' (متفق علیہ)

چھوٹے بڑے سارے گناہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مہربانی سے بخشے جا سکتے ہیں' مگر ایک گناہ ایسا ہے کہ جس کی بخشش سے اللہ تعالیٰ نے انکار کر دیا ہے۔ اس گناہ کو ظلم عظیم کہا گیا ہے اور وہ ہے شرک۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۳﴾﴾ (لقمان) ''بیشک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔'' شرک اس لیے ظلم عظیم ہے کہ اِس کا مرتکب اپنے عمل سے ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ'' کو جھٹلاتا ہے' جب کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ایمان کی بنیاد ہے۔ اللہ کے دَر کو چھوڑ کر اللہ کی مخلوق کے افراد کے سامنے دعا کے لیے ہاتھ پھیلانا اور ان کے اندر خدائی صفات ماننا ناسمجھی ہے۔

شرک کیا ہے؟

جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں لاشریک ہے' اسی طرح اس کی ہر صفت بھی بے مثال اور بے نظیر ہے۔ شرک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کو کماحقہ مخلوق کے کسی فرد میں تسلیم کرنا۔ نیز مخلوق کے کسی فرد کی صفت کو اللہ کی صفت کی طرح وسیع ماننا بھی شرک ہے۔ شرک توحید کا الٹ ہے۔ توحید کا تقاضا تو یہ ہے کہ تمام مراسمِ عبودیت خالص اللہ کے لیے ہیں۔ صرف وہی

ہے کہ جس سے دعا کی جائے۔ وہی رکوع اور سجدے کے لائق ہے۔ تمام نیک عمل اسی کی رضا کے لیے کیے جائیں۔ صدقہ وخیرات' نذر ونیاز' قربانی صرف اللہ کے لیے ہو۔ اللہ تعالیٰ کو بے نیاز اور اُسے ہر چیز کا خالق مانا جائے۔ اس کی مخلوق کا کوئی فرد ایسا نہیں جس میں خدائی صفات موجود ہوں۔ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور کوئی ذات بے نیاز نہیں' بلکہ مخلوق کا کوئی فرد' انسان ہو' جن ہو' یا فرشتہ' اُس کا نیاز مند ہے۔ مخلوق کے جس فرد میں کوئی صلاحیت یا خوبی ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کی عطا کردہ ہے۔ وہی موت وحیات کا مالک ہے' روزی رساں' مشکل کشا اور بگڑی بنانے والا ہے۔ الغرض جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں اکیلا ہے اسی طرح وہ صفات میں بھی یکتا ہے۔

شرک وہ گناہ ہے جس کی زد توحید باری تعالیٰ پر پڑتی ہے۔ اس لیے ایسا شخص اللہ کا باغی ٹھہرتا ہے اور باغی سخت ترین سزا کے لائق ہوتا ہے۔ بس یہی ایک گناہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ناقابلِ بخشش قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ کو بھی اور مومنین کو بھی شرک کے مرتکب کے لیے دعائے مغفرت مانگنے سے روک دیا ہے۔

ارشاد ہوا: ﴿مَا كَانَ لِلنَّبِىِّ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ يَّسۡتَغۡفِرُوۡا لِلۡمُشۡرِكِيۡنَ وَلَوۡ كَانُوۡۤا اُولِىۡ قُرۡبٰى مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُمۡ اَصۡحٰبُ الۡجَحِيۡمِ ﴿۱۱۳﴾﴾ (التوبۃ) ''پیغمبر اور مسلمانوں کو یہ روا نہیں کہ وہ مشرکین کے لیے بخشش مانگیں خواہ وہ اُن کے قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں اس کے بعد جب کہ ان پر واضح ہو چکا کہ وہ لوگ جہنمی ہیں''۔ شرک کے ناقابل بخشش ہونے کا اعلان خود اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں کر دیا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ وَيَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَمَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلاً ۢ بَعِيۡدًا ﴿۱۱۶﴾﴾ (النساء) ''اللہ تعالیٰ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا (اور گناہ) جس کے لیے چاہے بخش دے گا۔ اور جس نے اللہ کے ساتھ شریک بنایا وہ رستے سے دُور جا پڑا۔'' سورۃ النساء ہی میں اس طرح ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ وَيَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ يَّشَآءُ ۚ وَمَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَقَدِ افۡتَـرٰۤى اِثۡمًا عَظِيۡمًا ﴿۴۸﴾﴾ ''اللہ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا اور گناہ جس کو چاہے معاف کر دے گا۔ اور جس نے اللہ کا شریک مقرر کیا اُس نے بڑا بہتان باندھا۔''

شرک کی شناعت کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ سورۃ الانعام میں ۱۸ پیغمبروں کے

ناموں کا ذکر کر کے فرمایا: ﴿وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٨٨﴾﴾ ''اگر وہ لوگ بھی شرک کرتے تو جو عمل وہ کرتے تھے وہ سب ضائع ہو جاتے۔'' اگرچہ یہ محال ہے کہ اللہ کا کوئی نبی شرک کرے تاہم شرک کی شناعت واضح کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے بھی فرمایا گیا: ﴿وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٦٥﴾﴾ (الزمر) ''اور (اے محمد ﷺ!) تمہاری طرف اور ان (پیغمبروں) کی طرف جو تم سے پہلے ہو چکے ہیں یہی وحی بھیجی گئی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے عمل برباد ہو جائیں گے اور تم نقصان اٹھانے والوں میں ہو جاؤ گے۔''

شرک کے سوا کوئی ایسا گناہ نہیں جس کا ارتکاب کرنے والے کے بارے میں یہ کہا گیا ہو کہ وہ جنت میں داخل نہ ہوگا بلکہ اُس کے لیے جنت میں داخلہ حرام ہوگا۔ شرک کی برائی اس قدر واضح کر دی گئی ہے کہ ہر وقت آدمی خبردار رہے کہ اُس سے کوئی ایسا کام نہ ہو جائے جس میں شرک کا ادنیٰ سا بھی شائبہ ہو۔

اہلِ کتاب کی طرح مسلمانوں میں بھی یہ خام خیال در آیا ہے کہ ہمارے لیے ختم المرسلین محمد مصطفیٰ ﷺ کی اُمّت میں ہونا ہی بڑی فضیلت ہے، ہم لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا اقرار کرنے والے ہیں، ہمیں مشرک کیسے کہا جا سکتا ہے! مگر قرآن مجید کے اندر بڑے واضح الفاظ میں اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا گیا ہے کہ اللہ پر ایمان رکھنے والے بھی اکثر شرک کا ارتکاب کرنے والے ہیں۔ ارشاد ہوا: ﴿وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿١٠٦﴾﴾ (یوسف) ''اور اکثر لوگ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے مگر (اس کے ساتھ) شرک کرتے ہیں۔''

پس مسلمانوں پر لازم ہے کہ شرکیہ کاموں سے سخت اجتناب کریں، بلکہ ایسے کاموں سے بھی دور رہیں جن کے کرنے میں شرک کا شک و شبہ ہو، تاکہ اُن کے لیے جنت کا داخلہ بند نہ ہو جائے اور ناقص ایمان ان کے لیے سزا کا موجب نہ بن جائے۔

❁❁❁

میثاق، حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

جس کی افتتاحی تقریب میں ''وزیرِ رواداری و ہم آہنگی'' شیخ نہیان بن مبارک النہیان اور انڈیا کے سفیر سنجے سدھیر بھی شریک تھے۔ خبر رساں ادارے روئٹرز کے مطابق یہ مندر دبئی میں نہ صرف ''عبادت'' کی جگہ ہوگی بلکہ ایک ''علم کا مرکز'' اور معاشرے میں ''ہم آہنگی'' پیدا کرنے کے لیے بھی اہم ثابت ہوگا۔ بنی اسرائیل کا جرم کیا تھا؟

﴿وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠١﴾ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ﴾ (البقرة)

''اور جب آیا اُن کے پاس اللہ کی طرف سے ایک رسول (یعنی محمد ﷺ) تصدیق کرنے والا اُس کتاب کی جو ان کے پاس موجود ہے تو اہلِ کتاب میں سے ایک جماعت نے اللہ کی کتاب کو پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں۔ (اور) انہوں نے پیروی کی اُس علم کی جو شیاطین پڑھا کرتے تھے سلیمانؑ کی بادشاہت کے وقت۔''

اسی نام نہاد ہم آہنگی، روشن خیالی، ماڈرنائزیشن اور رواداری کے زعم میں عالمِ عرب سمیت پورا عالمِ اسلام اس وقت شیطان پرستی، شرک، بے حیائی، سود، فحاشی، ٹرانسجینڈر قوانین جیسے دجالی ایجنڈوں کی زد میں ہے۔ سورۂ آل عمران کی مذکورہ بالا آیت (۱۱۰) کی رو سے اس اُمّت کو فضیلت ایک عظیم مقصد کے لیے دی گئی تھی۔ اللہ نے اس اُمّت کے رسول ﷺ کو ایک مشن دے کر بھیجا تھا: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿٣٣﴾﴾ (الصف) ''وہی تو ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسولؐ کو الہدیٰ اور دین حق دے کر تاکہ غالب کر دے اسے کُل کے کُل دین (نظامِ زندگی) پر، خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔''

اب جب اُمّت خود اپنی فضیلت کے معیار اور اپنے عظیم مقصد سے سرنڈر کر چکی ہے تو محض فیفا ورلڈ کپ کا انعقاد، اس میں گونجنے والے نعرۂ تکبیر اور فلسطینیوں کے حق میں نعرے، جھوٹی شان و شوکت اسے کیا فائدہ پہنچائے گی؟ اللہ تعالیٰ نے زمانے کی قسم کھا کر سورۃ العصر میں بتا دیا کہ پوری انسانیت عظیم خسارے (جہنم) سے دوچار ہونے والی ہے، سوائے ان چند کے جو چار شرائط پر مشتمل چارٹر آف ڈیمانڈ کو پورا کریں گے۔ ان چار شرائط میں تواصی بالحق اور صبر بھی ہیں جو نام نہاد روشن خیالی، رواداری، ہم آہنگی، اعتدال پسندی اور دنیا پرستی کی نذر ہو چکی ہیں۔ یہ تو آخرت کے حوالے سے وارننگ ہے، لیکن اگر دنیا میں بھی ہمارا طرزِ عمل اہلِ بغداد جیسا رہا تو پھر ہمیں کسی اور ہلاکو خان کا انتظار کرنا چاہیے، کیونکہ اسی نام نہاد روشن خیالی، رواداری اور ہم آہنگی کے نام پر اہلِ بغداد بھی باطل نظریات اور افکار سے سمجھوتہ کر چکے تھے۔ ❁❁❁

Jan. 2023
Vol.72

Regd. CPL No.115
No.1

Monthly Meesaq Lahore

فلسفۂ انقلاب کے نقطۂ نظر سے
سیرت النبی ﷺ کا اجمالی مطالعہ

منہجِ انقلابِ نبویؐ

غارِ حرا کی تنہائیوں سے لے کر
مدینۃ النبیؐ میں اسلامی ریاست کی تشکیل
اور اس کی بین الاقوامی توسیع تک'
اسلامی انقلاب کے مراحل' مدارج اور لوازم پر مشتمل

بانیٔ تنظیم اسلامی
محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** رحمۃ اللہ علیہ
کے دس خطباتِ جمعہ کا مجموعہ

(جدید نظر ثانی شدہ ایڈیشن)

✿ صفحات: 360 ✿ قیمت: 500 روپے

✿✿✿

"منہجِ انقلابِ نبویؐ" کے مباحث کی تلخیص پر مشتمل کتابچہ

رسولِ انقلاب ﷺ کا طریقِ انقلاب

✿ صفحات: 64 ✿ قیمت اشاعت خاص: 125 روپے ✿ اشاعت عام: 60 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 3-35869501